سفرنامہ بمبئی

یعنی

لاہور سے بمبئی تک مختلف شہروں کی

اجمالی کیفیت اور شاعروں کا دلچسپ تذکرہ

مؤلفہ

منشی وجاہت حسین صاحب وجاہت جھنجھانوی

اڈیٹر رسالہ اصلاح سخن لاہور

سنہ ۱۹۱۰ء

مطبوعہ نول کشور گیس پرنٹنگ ورکس لاہور

اسد اللہ کاتب

قیمت ۱۲/

طبع اول

ہدیہ

یہ ناچیز سفرنامہ

عالی جناب نواب شمشیر بہادر صاحب اخگر

رئیس اعظم ریاست اجے گڈھ سنٹرل انڈیا

کی

خدمت میں بطور ہدیہ پیش کیا جاتا ہی

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

فہرست مضامین

تمہید

یہ سفرنامہ لٹریری حیثیت سے ایک نئی چیز ہے۔ اس طول طویل سفر میں مجھے اکثر شاعروں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو کسی نہ کسی طرح رسالہ اصلاح سخن سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر بہت سے سخنور ایسے بھی ہیں جن سے اس سفر میں میری ملاقات نہیں ہو سکی اور وہ میرے حالات سفر دیکھنے کے مشتاق ہوں گے لہذا مناسب سمجھا گیا کہ عام ناظرین اصلاح سخن کی آگاہی کے لئے واقعات سیاحت ایک کتابی شکل میں شایع کئے جائیں۔ مزید دلچسپی کے لئے فوٹو شامل کرنے کا بھی ارادہ تھا۔ مگر اب اصلاح سخن میں تصاویر کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے انشاء اللہ کبھی نہ کبھی میرا نمبر بھی آ ہی جائے گا اس وجہ سے یہ سفرنامہ بغیر تصویر ہی شایع کیا جاتا ہے ؛

میں نے اس سفرنامہ میں جو باتیں لکھی ہیں وہ بناوٹ اور رنگ آمیزی سے خالی ہیں۔ جس شہر میں جو کیفیت جس طرح پیش آئی راست راست بغیر کم و کاست لکھ دی۔ اگر ناظرین پسند فرمائیں تو زہے عز و شرف ؛

خاکسار
وجاہت جھنجھانوی
اڈیٹر اصلاح سخن

لاہور جنوری سنہ ۱۹۱ء

۷۸۶

لاہور سے بلند شہر

میں حسب قرارداد لاہور سے مارچ ۱۹۰۹ء کے پہلے ہی ہفتہ میں روانہ ہو چکا تھا۔ ۱۱۔ مارچ تک اضلاع سہارنپور و مظفرنگر کے بعض دیہات و قصبات میں خانگی وجوہ سے ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ اس لئے یہ گیارہ دن اصل سفرنامہ سے خارج سمجھنے چاہئیں۔ گیارہ مارچ کو بارہ بجے رات کے شاہدرہ سہارنپور لائیٹ ریلوے کے اسٹیشن تھانہ بھون سے سوار ہوکر علی الصباح شاہدرہ (دہلی) پہنچا۔ چونکہ بلند شہر اس مضمون کا اطلاعی خط بھیجا جا چکا تھا۔ کہ میں ۱۲۔ مارچ کو چھ بجے شام کی ٹرین سے بلند شہر پہنچونگا۔ اس لئے وقت گزارنے کے لئے چند گھنٹے غازی آباد میں قیام کیا۔ اور چار بجے کے قریب دوسری ٹرین میں سوار ہوکر خورجہ جنکشن پر اُترا۔ اور وہاں سے دوسری ریل نے ٹھیک ۶ بجے بلند شہر کے اسٹیشن پر پہنچا دیا۔ یہاں کسی صاحب سے ظاہری شناسائی نہ تھی۔ منشی ضمیر الدین احمد صاحب اشک۔ مولانا آغا رفیق رحمت۔ ندیم۔ اثر۔ وغیرہ ہواخواہان اصلاح سخن پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ میں نے گاڑی سے اتر کر اپنا ٹرنک اور بستر قلی کو دیا۔ اور بلند شہر کی پارٹی میں جناب اشک کو در نشین سمجھ کر معمولی سلام کیا۔ انہوں نے کہا اڈیٹر اصلاح سخن! میں نے جواب دیا ہاں! یہ سُن کر اُنہوں نے نہایت تپاک سے مصافحہ کیا۔ اور دیگر احباب بلند شہر سے یکے بعد دیگرے تعارف کرایا۔ جب اسٹیشن سے باہر آئے۔ تو یہ اتفاق کی بات ہے۔ کہ اُس روز کوئی گاڑی نہ ملی۔ آخر میرا اسباب

میاں رحمت۔ نذیم۔ اثر وغیرہ نے اُٹھایا۔ اور ہماری مختصر سی پارٹی شہر کی طرف پیدل روانہ ہوئی۔ شام کا وقت۔ ٹھنڈی ہوا۔ نئے احباب کی ہمراہی۔ مجھے اسوقت خاص سرور حاصل ہؤا۔ جائے قیام پر پہنچنے سے پہلے جملہ احباب نے مسجد میں مغرب کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد جناب اشک جنرل مرچنٹ کی دُوکان پر مجمع رہا شب کے کھانے سے فراغت پاکر اشک صاحب مجھے اپنے اُس مکان میں لے گئے۔ جو اُنہوں نے پہلے سے میرے قیام کے لیئے تجویز کر رکھا تھا۔ چونکہ میں رات بھر کا جاگا ہؤا تھا۔ اس لیئے سویرے سو گیا۔ صبح کو مطبع ہریشاد بلندشہر دیکھا۔ یہ ایک چھوٹا سا مطبع ہے۔ کاتب اور پریس مین وقت سے ملتے ہیں۔ مگر مالک مطبع کی ہمت قابل تعریف ہے۔ کہ وہ برابر اس کام کو چلائے جاتے ہیں۔ رسالہ یدبیضا سکندر آباد اسی مطبع میں چھپتا ہے۔ مالک مطبع خلیق اور ہوشیار آدمی ہیں +

اس کے بعد حکیم فریدالدین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ پرانے آدمی ہیں بلندشہر میں معزز سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں سے فارغ ہو کر مولوی انوار حسین صاحب بی۔ اے وکیل سے ملاقات کی۔ یہ صاحب نئے تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بھی شعر و شاعری سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ نہایت روشن خیال خلیق اور ملنسار آدمی ہیں۔ ان سے مل کر جی خوش ہو گیا +

پنڈت پریم سکھ داس صاحب شاد بلندشہری کچھ عرصہ پہلے ضلع مظفر نگر میں مشہور سب انسپکٹر پولیس تھے۔ معلوم ہؤا کہ آجکل ٹانگ میں چوٹ لگ جانے کی وجہ سے چل پھر نہیں سکتے۔ اس لیئے میں اور آغا رفیق اور منشی ضمیرالدین اشک ان کے مکان پر گئے۔ اور دیر تک شعر و شاعری کے

چرچے رہے ؎

لطیفہ - میں جب بلند شہر گیا۔ تو اُنہیں دنوں کسی بلند شہری نے سردار امرتسری کے مضمون تاریخ گوئی مندرجہ اصلاح سخن پر کچھ اعتراض چھپوائے تھے۔ پنڈت پریم سکھ داس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ نے آگرہ اخبار دیکھا ہے۔ میں نے کہا۔ ہاں۔ اس وقت ہم چار آدمی موجود تھے۔ اور شاد صاحب آغا رفیق سے واقف نہ تھے۔ اُنہوں نے بے تکلف دریافت کیا۔ آپ جانتے ہیں۔ وہ مضمون کس نے لکھا ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ فرمایا۔ کہ صاحب اُسی .... کا لکھا ہوا ہے۔ چونکہ آغا رفیق بھی موجود تھے۔ اس لئے میں نے فوراً دوسری بات شروع کر دی۔ بعد میں پنڈت صاحب کو اصل کیفیت معلوم ہوئی۔ تو بہت ہنسے اور فرمایا کہ ہم آغا رفیق سے واقف نہ تھے ؎

یہ لطیفہ اس وجہ سے لکھا گیا۔ کہ دیگر احباب ایسے موقع پر احتیاط رکھیں۔ اور سوچ سمجھ کر گفتگو کیا کریں ؎

اگلے روز مولوی عبداللہ صاحب صوفی امام جامع مسجد سے ہم سب لوگ مسجد میں جا کر ملے۔ انہوں نے تعلیم و تعلّم کا سلسلہ بھی جاری کر رکھا ہے۔ پرانی وضع کے بزرگ ہیں۔ نعتیہ اشعار زیادہ کہتے ہیں۔ اپنے مطبوعہ دیوان کی چند غزلیں ایک صاحب سے (جو خوش الحان تھے) پڑھوا کر سنائیں۔ قابل زیارت بزرگ ہیں +

ان کے علاوہ سیٹھ مہادیو پرشاد صاحب رئیس بلند شہر۔ محمد حسین صاحب شرر۔ محمد سلیمان۔ مدرس تحصیلی سکول سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ سب صاحب خلوص و مہربانی سے پیش آئے۔ اسی روز حکیم صاحب کے ایک شاگرد پیغام لیکر آئے۔ کہ حضرت حکیم آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا چشم ما

روشن دل ماشاد مگر بعد میں یہ منشا معلوم ہوا کہ ضیغم صاحب خود میرے پاس آنا نہیں چاہتے - بلکہ مجھے بلاتے ہیں - حضرات بلند شہر کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ ضیغم صاحب ایک مدقّق اور خود پسند شاعر ہیں - اس لیئے اس شرط کی پابندی فضول سمجھی گئی +

میں بلند شہر میں منشی ضمیر الدین اشک کے ہاں مہمان رہا - مولانا آغا رفیق اور مولوی انوار حسین صاحب وکیل نے بھی مہمان نوازی میں حصّہ لیا - اور تین دن بلند شہر میں اچھے لطف سے بسر ہوئے +

منشی ضمیر الدین اشک اور مولانا آغا رفیق میں شاعرانہ رقابت پائی گئی - انکی اس ناچاقی نے میرے دل میں بھی چاقو مار دیا - حضرت اشک ایک مرد متین اور دانا و زیرک آدمی ہیں - شاعروں میں ایسے بزرگ بہت کم ہوتے ہیں بلند شہر میں ان کی اچھی آبرو ہے - آغا رفیق صاحب خود کو اعلیٰ درجے کا عربی داں ظاہر کرتے ہیں مصر کے عربی اخبارات کی نسبت مجھ سے اُن کی زیادہ گفتگو رہی بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آغا رفیق صاحب کو عربی زبان میں یدطولیٰ حاصل ہے - خدا کرے - وہ جیسا خود کو سمجھتے ہیں - حقیقت میں بھی ویسے ہی ہوں - میری عقل ناقص ان کی قابلیت کا صحیح اندازہ کرنے میں قاصر رہی +

بلند شہر ایک چھوٹی سی مگر خوبصورت اور آباد بستی ہے - پہلے یہاں ریل نہیں تھی - مگر اب چند سال سے اودھ - روہیلکھنڈ ریلوے نے ایک شاخ نکال دی ہے - شہر سے مغربی جانب ایک باغ میں گھنٹہ گھر بنا ہوا ہے - اور اس میں ملکہ معظمہ کا سٹیچو (مجسمہ) نصب ہے - شام کے وقت اکثر جنٹلمین اس جگہ ہوا خوری کو آتے ہیں - روشوں پر بنچیں پڑی ہیں - اس شہر میں یہ خاصی

٭ اس حرف میں رقت دانستہ لکھ گئے ہے - مؤلف

تفریح گاہ ہے۔

بلند شہر کی آبادی کا ایک حصّہ کسی قدر بلندی پر واقع ہے۔ یہی غالباً اسکی وجہ تسمیہ ہے۔ میں بلند شہر کے احباب سے مل کر بہت خوش ہوا۔ حضرت اشک نے نہایت کشادہ دلی اور خندہ پیشانی سے مجھے مہمان رکھا۔ میں ان کی عنایت کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ اسی طرح مولانا آغا رفیق اور مولوی انوار حسین صاحب وکیل اور پنڈت پریم سکھ داس بھی شکر گزاری کے مستحق ہیں۔ نئی اُمت میں رحمت اللہ رحمت۔ مشتاق حسین ندیم۔ عبد العزیز اثر کی تاثیر محبت بھی دل میں گھر کر گئی۔

علی گڈھ

۱۶۔ مارچ سنہ ۱۹۰۹ء کو بلند شہر سے روانہ ہو کر شام کے سات بجے علی گڈھ پہنچا۔ اور محلہ آتش بازاں میں محمد مظہر صاحب مظہر سب انسپکٹر پولیس کے ہاں مقیم ہوا۔ مظہر صاحب اصلاح سخن کے سچے بہی خواہ ہیں۔ ان کے پاس ایک دن ٹھہرنے کا ارادہ تھا۔ مگر ان کے اصرار نے پانچ دن تک نہ ہلنے دیا۔

بابو منگل سین صاحب بیدل جھنجھانوی سپرنٹنڈنٹ چنگی علی گڈھ سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ صاحب پرانے کرم فرما اور عنفوان شباب کے دوست ہیں۔ ہندو صاحبان میں ان سے زیادہ میرا گہرا تعلق آج تک کسی سے نہیں رہا۔ قسام ازل نے حسن سیرت کے علاوہ حسن صورت کا بھی خاص حصّہ دیا ہے۔ انہوں نے میری دعوت کی۔ اور کھانے کا انتظام اپنے ایک ماتحت مسلمان ملازم چنگی کے ہاں کیا۔ مگر میں ان کھانوں سے زیادہ خوش نہیں ہوا۔ آخر میں نے بابو صاحب سے کہا۔ کہ جناب میں تو آپ کے ہاں ہندوانی کھانا کھانا چاہتا

تھا۔ آپ نے اس تکلف سے میری اُمید کا خون کر دیا +

علی گڑھ سے ایک روز کے لئے تحصیل کھیر گیا۔ یہاں کی پولیس میں میرے مخدوم و محسن منشی الطاف حسین صاحب سب انسپکٹر مہتمم اسٹیشن ہیں۔ یہ صاحب تین سال تک قصبہ جھنجھانہ ضلع مظفر نگر میں بعہدہ تھانہ داری ممتاز رہکر ضلع علی گڑھ کو تبدیل ہو گئے تھے۔ اب چھ سال کے بعد ملاقات حاصل کرنے کا موقع ملا۔ آپ وہ پہلے سب انسپکٹر ہیں۔ جھنجھانہ میں خاکسار راقم کے حال پر ہمیشہ عنایت کی نظر رکھی۔ آپ کے ماتحت سب انسپکٹر منشی ہادی حسن بھی نہایت روشن خیال اور سنجیدہ پولیس افسر ہیں۔ میں ان کی خوش خلقی کا بدل شکر گزار ہوں۔ خصوصاً جن الفاظ میں منشی الطاف حسین صاحب نے معزز اہلکاران پولیس و تحصیل سے میرا تعارف کیا۔ میں اُن کو اُن کی محبت و بزرگی کا باعث سمجھتا ہوں۔ ورنہ من آنم کہ من دانم +

میں یہاں صرف ایک شب ٹھہرا اگلے روز میں اور تھانہ دار صاحب یکہ میں سوار ہو کر علی گڑھ چلے آئے۔ شام کو بغرض ادائے نماز مغرب مجھے جامع مسجد میں جانے کا اتفاق ہُوا۔ وقت میں کچھ دیر تھی۔ اس لئے حوض کے کنارے بیٹھ کر جنگلی کبوتروں کی سیر دیکھنے لگا۔ جو اِدھر اُدھر سے جوق جوق آکر جامع مسجد کے میناروں پر بیٹھتے تھے کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ایک دُبلے پتلے صنعل ہریا ہاتھ میں کاغذ پنسل لئے دروازہ سے آتے دکھائی دیئے اور صحن میں آکر ٹہلنے لگے۔ اب میری نظر کبوتروں کی طرف سے ہٹ کر اس شخص کی نقل و حرکت کو تاڑنے لگی۔ انہوں نے ایک مرتبہ مسجد کے گنبدوں پر دیر تک نگاہ ڈالے رکھی آخر میرے پاس آکر پوچھا کہ جناب یہ گنبد ٹھوس ہیں یا کھوکھلے ؟ میں نے کہا

آپ بھی یہیں ہیں۔ گنبد بھی سامنے موجود ہیں۔ اندر جاکر دیکھ لیجئے۔ اطمینان ہوجائیگا جب وہ چلے گئے۔ تو مجھے خیال گزرا کہ یہ شخص غالباً سعید احمد مارہروی ہے جو آثار قدیمہ اور تعمیرات دیرینہ پر مضمون لکھا کرتا ہے۔ واپس آنے پر میں نے اُن سے کہا کہ حضرت کیا آپ مارہرہ کے رہنے والے ہیں؟ اُنہوں نے جواب دیا۔ ہاں۔ پھر پوچھا کیا آپ کا نام سعید احمد ہے؟ اس کا جواب بھی اثبات میں دیا۔ اور وہ متعجبانہ میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے کہا یہ کوئی روشن ضمیر فقیر نہیں۔ آپ کی کتابیں اور مضامین دیکھنے سے خیال ہوا۔ کہ شاید آپ سعید احمد مارہروی ہیں۔ بابو منگل سین کے مکان پر منشی عبدالغفور صاحب ناولسٹ ڈپٹی شاپ علی گڈھ سے بھی ملاقات ہوئی۔ دونوں کی خوب گھٹنڈی ملی ہے۔ ناول تصنیف کرنے میں مشغول رہتے ہیں سہارنپور مظفر نگر۔ بلند شہر سے گزر کر علی گڈھ میں اُردو زبان کا فرق معلوم ہوا یہاں کے باشندے گیا کو گیو اور دیا کو دیو بولتے ہیں۔ گویا پوربی اثر علی گڈھ سے شروع ہوجاتا ہے *

مارہرہ ضلع ایٹہ

۲۱۔ مارچ سنہ ۱۹۰۹ء کو ۱۰ بجے کے قریب علی گڈھ اسٹیشن سے مارہرہ کا ٹکٹ لیا۔ ہاتھرس جنکشن سے بمبئی بڑودہ اینڈ سنٹرل انڈیا ریلوے کی چھوٹی گاڑی ملی۔ اُس نے ڈھائی بجے کے قریب مارہرہ پہنچا دیا۔ اسٹیشن پر عزیزی سید محمد احسن خلف اکبر حضرت علی احسن صاحب اطہر فصیح الملک مع ملازم موجود تھے۔ اسٹیشن سے یکّے میں سوار ہوکر

شہر تک آئے برادر مکرم حضرت احسن مارہروی آرام کرسی پر منتظر بیٹھے تھے۔ جب میں پہنچا۔ تو اٹھ کر بغل گیر ہوئے۔ اور سب سے پہلے مجھے اُس خانقاہ میں لے گئے جہاں اُن کے بزرگ آسودہ ہیں۔ اور جن کی وجہ سے مارہرہ مارہرہ شریف کہلاتا ہے۔ آپ نے نام بنام ہر بزرگ کا مزار بتایا۔ اور اُس کے متعلق کچھ تاریخی کیفیت بھی بیان فرمائی۔ اس خانقاہ میں بہت سی تربتیں ہیں۔ کچھ جاگیر بھی وقف ہے جس کے ایک متولی و سجادہ نشین حضرت احسن مارہروی بھی ہیں۔ خانقاہ کی درستی و صفائی وغیرہ کے لئے ملازم مقرر ہیں یہ خانقاہ حضرت احسن کے مکان سے بالکل قریب ہے۔ زیارت و فاتحہ سے فراغت پاکر ہم واپس چلے آئے۔ شمال کی طرف ایک بیٹھک میں سید افتخار عالم صاحب مارہروی کچھ لکھ پڑھ رہے تھے۔ چند منٹ کے بعد وہ بھی مجھ سے آکر ملے۔ اور مختلف معاملات پر پُر معنی گفتگو ہوتی رہی۔ خصوصاً مولوی حافظ نذیر احمد صاحب دہلوی کی نئی کتاب اُمہات الامۃ کا اُس وقت بہت چرچا تھا۔ میں ڈپٹی صاحب کے طرز بیان کو سُوقیانہ اور قابل اعتراض سمجھتا تھا برادر مکرم حضرت احسن مارہروی بھی میرے ہمخیال تھے۔ مگر سید افتخار عالم صاحب ہمارے قول و خیال کی تردید فرماتے رہے۔ اس کے بعد کتاب کے چند مضامین حضرت احسن نے بآواز بلند پڑھ کر سنائے۔ اور مختلف جملے ایسے نکال کر دکھائے۔ جن میں ازواج مطہرات کے حفظ مراتب کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ اگرچہ اس بحث کا کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ مگر فی نفسہٖ مکالمہ نہایت دلچسپ تھا۔ سید افتخار عالم صاحب مولوی نذیر احمد سے حسن عقیدت رکھتے ہیں۔ آجکل سوانح نذیر احمد قلمبند کرنے میں مصروف ہیں۔ انہوں نے ڈپٹی صاحب کی

نظمیں بھی ایک جگہ جمع کر دی ہیں۔ اور اس کتاب کا نام مجموعۂ نظم بے نظیر رکھا ہے
مارہرہ میں جس شخص کی ملاقات سے مجھے زیادہ خوشی ہوئی۔ وہ میر قطب الدین
صاحب اشک جلیسری ہیں۔ میں جس وقت پہنچا۔ تو حسن اتفاق سے میر صاحب
موصوف بھی مارہرہ موجود تھے۔ اور مکان کے قریب مسجد میں اللہ اللہ کر رہے
تھے۔ حضرت احسن اُن کو مسجد سے اُٹھا کر لائے۔ اور مجھ سے ملاقات کرائی
میر قطب الدین ایک کہن سال پیر مرد ہیں۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند اور بااوقات
بزرگ ہیں۔ پیری مریدی کا سلسلہ بھی جاری کر رکھا ہے۔ اُنہوں نے اُستادی
حضرت نواب فصیح الملک داغ دہلوی مرحوم کی رفاقت میں زندگی کا بڑا حصّہ
بسر کیا۔ شاید ہمارے برادران خواجہ تاشش میں ان سے زیادہ کسی کو اُستاد
مرحوم کے پاس رہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہ وہ میر قطب الدین ہیں۔ جن کی
نسبت اُستاد مرحوم اپنی مثنوی فریاد داغ میں فرما گئے ہیں ؎

میرے ہمراہ میر قطب الدین اشک ریزاں بحالت غمگیں

میر صاحب اُستاد مرحوم کی مجسّم تاریخ ہیں۔ رامپور۔ کلکتہ۔ عظیم آباد۔ حیدرآباد
دکن وغیرہ کے مشاعروں اور معرکوں کی کیفیت سُنا کر ہمیں بے حد محظوظ کیا
ہر روز شام کے پانچ بجے میں اور میر صاحب کاسگنج کی سڑک پر میل ڈیڑھ
میل ہوا خوری کو جایا کرتے تھے۔ رستے میں اُستاد مرحوم ہی کا ذکرِ خیر رہتا
تھا میرے لئے اس سے زیادہ کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ غرض مارہرہ میں یہ
چار پانچ دن نہایت لطف سے گزرے ٭

ایک روز کا ذکر ہے کہ ۹ بجے کے قریب حضرت احسن کی ڈاک آئی
اُس میں ایک لفافہ سے حضرت ریاض کی تازہ غزل برآمد ہوئی۔ برادر مکرم

حضرت احسن نے فرمایا۔ کہ لو آج اچھا مشغلہ مل گیا ہے۔ اس طرح پر تم بھی غزل کہو۔ میں بھی کہتا ہوں۔ میر صاحب بھی کہیں گے۔ میں نے کہا۔ یہ ٹھیک نہیں۔ بعض کم مایہ اس طبع آزمائی کو حضرت ریاض کا مقابلہ سمجھیں گے احسن صاحب نے کہا میں تو صرف اس وجہ سے کہواتا ہوں۔ کہ تمہارے اور میر صاحب کے مارہرہ آنے کی یادگار رہے۔ ورنہ جو خیال تم نے ظاہر کیا ہے۔ میں خود بھی اُسے محسوس کرتا ہوں۔ ہر عمل نیّت پر منحصر ہے جب ہمارا یہ خیال نہیں۔ تو لوگوں کی بدگمانی کی پروا فضول ہے میں نے کہا اچھا کھانا کھانے کے بعد میر اشتیاق پنسل کاغذ لے کر مسجد میں چلے گئے میں اور حضرت احسن قیلولہ کی غرض سے چوکیوں پر دراز ہو گئے۔ پنسل کاغذ ہمارے پاس بھی تھا۔ سوتے جاگتے جو اشعار موزوں ہوئے۔ ظہر کی نماز کے بعد روشنائی سے صاف کر کے حضرت احسن کے حوالے کر دیئے۔ میر قطب الدین بھی غزل کہہ لائے۔ پھر ہر شخص نے اپنے اپنے اشعار خود پڑھ کر سنائے۔ یہ گویا ایک چھوٹا سا مشاعرہ تھا۔ جو حضرت ریاض کی وجہ سے مارہرہ میں منعقد ہو گیا۔ یہ چاروں غزلیں اپریل کے فصیح الملک میں چھپ چکی ہیں۔ مگر تفنن طبع ناظرین کے لئے یہاں بھی درج کی جاتی ہیں ایڈیٹر صاحب فصیح الملک نے غزلوں سے پہلے ایک طویل نوٹ میں حضرت ریاض کو خوب داد غزل دی ہے۔ اُس کے آخری فقرے جو مجھ سے متعلق ہیں یہ ہیں:۔

جس وقت یہ غزل (حضرت ریاض کی غزل سے مراد ہے) ہمیں موصول ہوئی ہے۔ حسن اتفاق سے اُس روز ہمارے دو معزز مہمان بھی موجود

تھے۔ ایک مکرمی جناب اشک جو اُستاد مرحوم کے قدیمی رفقائیں ہیں۔ دوسرے عزیز مکرم جناب وجاہت جھنجھانوی اڈیٹر اصلاح سخن لاہور ان سخن شناسوں کی موجودگی میں اس غزل نے جو لطف دیا وہ بیان نہیں ہو سکتا۔ من دانم و داند دل من +

حضرت ریاض

ڈھل چکی ہے اب جوانی جائیگی — یہ شرابِ ارغوانی جائیگی
ہو گی وہ دل میں جو ٹھانی جائیگی — کیا کسی کی بات مانی جائیگی
آگ بن کر آئی کیا تیغ پر آب — آئی ہے تو ہو کے پانی جائیگی
خضر یوں ہی گم رہیں گے عمر بھر — یوں ہی عمر جاودانی جائیگی
تیغ ہی کیا ہاتھ میں قاتل کے تھی — اے حنا تو بھی تو سانی جائیگی
آئے تارے ہجر کی شب میں نظر — اب بلائے آسمانی جائیگی
عرش پر ہے خوش جماؤں کا مزاج — کیونکر ان کی لنترانی جائیگی
خدمت میخانہ کر لے رند شیخ — رائیگاں یہ زندگانی جائیگی
شوخیاں کہتی ہیں کھل کھیلینگے وہ — اب حیا کی پاسبانی جائیگی
آگ بنکر جام میں آئیگی مے — زمزمی میں ہو کے پانی جائیگی
موت سنتے ہیں بڑھاپا آئیگا — جان سے اچھی جوانی جائیگی
بو سے سن کر دل کی پامالی کا حال — کس گلی کی خاک چھانی جائیگی
بوئے گیسو سے ہیں جیب پر جبیں — رات بھر کیا سر گرانی جائیگی
جان سے بڑھکر اسے رکھئے عزیز — کیا تجھے جوانی جائیگی

شیخ نے مانگی ہے اپنی عمر کی
میکدہ سے اب پرانی جائیگی

نالے کرنا سیکھتے ہیں عندلیب
اب یہ طرز نغمہ خوانی جائیگی

جا چکے ہیں آپ کل دشمن کے گھر
آج مرگ ناگہانی جائیگی

ساتھ لائے ہیں قفس سے ناتواں
جاتے جاتے ناتوانی جائیگی

پینے آتے ہیں فرشتے خود ریاض
خم کے دامن میں چھپانی جائیگی

جناب اشک جلیسری

اشک یوں کیا تیری مانی جائیگی
پہلے برسوں خاک چھانی جائیگی

سخت ہے جانوں کی نہ مانی جائیگی
ہفت خنجر کی روانی جائیگی

بدظنی یا بدگمانی ہو تری
ساتھ میرے کچھ نشانی جائیگی

وہ بھی لفظوں میں ادھر ہے یا اُدھر
حشر میں کیا یہ کہانی جائیگی

واعظا اس صورت پہ عزم خلد و حور
کیا یہی صورت ڈرانی جائیگی

ڈھونڈتے ہیں ہم نشان مدعا
اب تو بیشک خاک چھانی جائیگی

دل تو مہمان خیال یار ہے
دیکھیں کب یہ میہمانی جائیگی

وہ دو باتیں رد و بد موسیٰ کے ہوں
پھر تو اُن کی لن ترانی جائیگی

میرے اُن کے روز اول ٹھن چکی
اب نئی کیا اُن سے ٹھانی جائیگی

گر خدا اُس سے تو سن لو گے مری
گر خدا مانے تو مانی جائیگی

کھل گئی ہے مایگی تیری عدم
خلق سے کر دانہ پانی جائیگی

مجھ کو بھی ضد ہے یہ کہوا کر رہوں
تو ہی خود کہہ دے کہ مانی جائیگی

کچھ حقیقت خط میں لکھ کر بھیج دی
کچھ پیامی کی زبانی جائیگی

اک طرف کے ہو کے وہ گر بیٹھ جائیں
روز کی یہ کھینچا تانی جائیگی

دل لگی کو کھیل ہی سمجھے تھے اشک
کیا خبر تھی خاک چھانی جائیگی

حضرت احسن مارہروی

آئے گی پیری جوانی جائیگی
کیا جوانی زندگانی جائیگی

رائیگاں ساری کہانی جائیگی
ایک بھی میری نہ مانی جائیگی

خلد میں تر دامنوں کے واسطے
آتش تر بن کے پانی جائیگی

عرض وصل اے دل عبث کرتا ہے تو
یہ نہ مانی ہے نہ مانی جائیگی

آرزوئے خلد اے واعظ نہ چھوڑ
سیر ملک جاودانی جائیگی

تم رہو میری فغاں سے مطمئن
یہ ہوائی آسمانی جائیگی

ہجر میں اک دل ہی کیا مرجائیگا
سب بہار زندگانی جائیگی

محفل رنداں میں تم جب آئیگا
تیری حضرت شیخ فانی جائیگی

گھر سے باہر جب قدم رکھو گے تم
ساتھ میری زندگانی جائیگی

تم نہ پگھلو گے مگر اف پھر بھی
آگ بھی لینے کو پانی جائیگی

میں اگر اٹھا ترے در سے تو پھر
غیر کی بھی پاسبانی جائیگی

خوش ہے احسن آئینہ پا کر ہجر
آئیں گے وہ ناتوانی جائیگی

تیری ٹھوکر کھوئے گی میرا خمار
پاؤں پڑ کر سرگرانی جائیگی

کیوں فرشتہ جان لیں دشمن کو ہم
ماننے کی بات مانی جائیگی

[illegible]
[illegible]

عشق کی سمجھے تصور [illegible]
[illegible] نہ جانی جائیگی

طور پر ہم ہیں نہ وہ ہیں عرش پر
پھر نہ کیونکر لنترانی جائیگی

کیوں لکھیں ہم حال مرگ غیر ہاں
یہ سنانی منہ زبانی جائیگی

پائی احسن تو نے منہ مانگی مراد
اب تو تیری نوحہ خوانی جائیگی

وجاہت جھنجھانوی

بے نشاں ہو کر جوانی جائیگی
خاک تک ہم سے نہ چھانی جائیگی

موت سے یہ زندگانی جائیگی
اب نئی آئی پرانی جائیگی

دل پہ لے جاؤنگا انکا داغ عشق
ساتھ میرے یہ نشانی جائیگی

وہ سنیں گے حال میری موت کا
یہ خبر اُن تک زبانی جائیگی

تیغ باندھی ہے کمر سے یار نے
اب ہماری ناتوانی جائیگی

مہر و الفت کا زمانے میں ہے کال
دیکھیے کب یہ گرانی جائیگی

قدر کیا جانیں ابھی وہ عشق کی
جان ہم دینگے تو جانی جائیگی

موت کا ڈر ہے جہاں جائیں گے ہم
ساتھ مرگ ناگہانی جائیگی

یاد جو ہم کو رہے گا جیتے جی
دیکھئے وہ چہرہ کا جوانی جائیگی

نیند آئیگی کفن میں چین سے
خوب چادر سر پہ تانی جائیگی

ہو گیا الفت میں اُنکی غیر حال
اب تو میری بات مانی جائیگی

کیا بتاؤں نوک مژگاں کا خیال
لذت درد نہانی جائیگی

سب طرح رسوا ہوا ہوں عشق میں
دور تک میری کہانی جائیگی

مان لو کہتے ہیں اب شستہ ہم
ورنہ پھر کچھ اور ٹھانی جائیگی

ہیں مسلماں نام کو کافر ہے وہ بُت
مدتوں میں بدگمانی جائیگی

دیکھنے والا کوئی دیکھے گا جب — سب تمہاری لن ترانی جائیگی
جان ہے بس دم کی سچّی جاں نثار — ساتھ راجا کے یہ رانی جائیگی
اے وجاہت کون ہے اب قدرداں — رائیگاں یہ خوش بیانی جائیگی

مارہرہ شریفوں کی بستی ہے۔ سادات اور کمبوہ یہاں کے معزز فرقے ہیں۔ برادر مکرم حضرت احسن کا خاندان عموماً واجب التعظیم سمجھا جاتا ہے۔ ان کے بزرگ اب بھی بڑے پایہ کے عالم فاضل ہیں۔ حضرت مولوی عبد الجلیل اور مولوی نور عالم صاحب عربی و فارسی کے زبردست ادیب ہیں۔ میں سمجھتا تھا۔ یہ بزرگ معمولی ملّا ہیں۔ مگر جب ایک دن علم عروض کی بحث چھڑی اور انہوں نے زحافات پر غیر معمولی روشنی ڈال کر بال کی کھال نکالی۔ تو میں حیران و ششدر رہ گیا۔ مولانا عبد الجلیل فارسی زبان میں فکر فرماتے ہیں۔ تاریخ گوئی میں اچھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ داغ مرحوم کی تواریخ وفات کے علاوہ اور بہت سے قطعے اور تاریخیں مجھے سنائیں۔ اکثر مادّے بالکل صاف اور برجستہ اور ان کی کہنہ مشقی پر دال تھے۔ یہاں کے خورد سال بچوں کو بھی میں نے نہایت مؤدّب و مہذّب پایا۔ یہاں پرانی تہذیب و شائستگی اب تک اچھی حالت میں ہے۔

سیّد جان عالم اور سیّد امیر حسین صاحب دلبر مارہروی سے بھی ملاقات ہوئی۔ مہذّب و متین آدمی ہیں۔ حضرت احسن نے بوقت روانگی اپنا فوٹو عنایت کیا۔ جو کسی وقت اصلاح سخن میں شایع کیا جائیگا۔

آگرہ

۲۶۔ مارچ کو ۹ بجے کے قریب میں اور میر قطب الدین صاحب اشک مارہرہ اسٹیشن سے سوار ہوئے۔ میر صاحب مارہرہ سے دوسرے اسٹیشن اکسولی پر اتر گئے۔ میں سیدھا آگرہ چلا گیا۔ اور ۲ بجے آگرہ فورٹ اسٹیشن پر جا اترا۔ رات کو سرا ئے میں مقیم رہا۔ اگلے روز جب شاہ نظام الدین صاحب دلگیر سے ملنے گیا تو انہوں نے میرا اسباب اپنے مکان پر منگا لیا۔ مجھے روضۂ تاج گنج کے دیکھنے کی مدت سے تمنا تھی۔ اگلے روز میں اور حضرت دلگیر و جناب ماہر اکبر آبادی سیر کو روانہ ہوئے۔ تاج گنج سے پہلے نظیر اکبر آبادی کے مزار کی زیارت کی۔ اور فاتحہ پڑھ کر آگے بڑھے۔ تاج گنج کے سر بفلک مینار اور عالی شان گنبد دنیا کی ناپائداری کا ثبوت دے رہے تھے۔ ان ہر دو مقامات کے دیکھنے سے میرے ذہن میں جو خیالات پیدا ہوئے۔ وہ میں نے دلگیر صاحب کے مکان پر واپس آکر علیحدہ علیحدہ نظموں میں ظاہر کئے۔ پہلی نظم رسالہ زبان دہلی مطبوعہ ماہ مارچ میں بھی شایع ہو چکی ہے:۔

خدا کی شان ہے انسان کی خاک بستی ہے
برائے نام عدم کی بھی ایک بستی ہے

کیا ہے گور غریباں کا ہم نے نظارہ
یہ وہ جگہ ہے جہاں بیکسی برستی ہے

سفید ہے کوئی تربت تو کوئی ہے خاکی
کسی کی زرد ہے رنگت کسی کی دھنستی ہے

اجل کا ڈر نہیں سوتے ہیں بے خطر ہو کر
کہ موت اس جگہ مہنگی ہے نیند سستی ہے

بلا سے قبر پہ گر کوئی ٹھوکریں مارے
انہیں خبر نہیں ہوتی عجیب مستی ہے

تمام شہر خموشاں میں ہُو کا ہے عالم
سخنوروں کی یہاں گم سخن پرستی ہے

یہ لوگ پہلے ہی ہوتے ہیں جان سے بیزار
اجل فضول شکنجے میں ان کو کستی ہے

ہوئی ہے جن کے کلام بلند کی شہرت
دبے وہ خاک میں کیسی یہ آدپستی ہے

نظیر شاعر بے مثل اکبر آبادی
پڑے ہیں شہر سے کچھ دور اگرچہ بستی ہے

مگر مزار پہ ان کے کوئی نہیں کتبہ
یہ اہل شہر کی بین دلیل پستی ہے

لگائیں ان کے سرہانے کوئی نشان ضرور
یہ کام چندہ سے کرلیں جو تنگ دستی ہے

غضب ہے قبر پہ جاکر بھی جب نہ ہو معلوم
نظیر کی یہیں مدفن یہ خاک ہستی ہے

یہیں نظیر کے بیٹے اسیر بھی ہیں دفن
نگاہ دونوں کے دیدار کو ترستی ہے

بری طرح سے مزار اسیر ہے پامال
عجیب لوگ ہیں بے درد ساری بستی ہے

انہوں نے رستہ بنایا ہے توڑ کر دیوار
غضب کے پاؤں نکالے ہیں تیز دستی ہے

جو چند روز رہے گی سڑک یونہی جاری
ملے گی خاک میں تربت کی اب جو ہستی ہے

چراغ ہے نہ کوئی پھول اسکی تربت پر
خدا کے فضل سے رحمت مگر برستی ہے

کھڑا ہے نیم کا سوکھا سا اک درخت قریب
نہ جھومتا ہے نہ باقی کچھ اسکی مستی ہے

ثواب روح کو بخشا خلوص سے ہم نے
اٹھائے ہاتھ یہ گویا فراخ دستی ہے

جناب ماہر و دلگیر میرے ساتھ رہے
یہ ان کی خاص اعانت سخن پرستی ہے

کبھی اجل سے وجاہت کوئی بچا نہ سکے
بلا ہے اژدھے یہ ناگن سبھی کو ڈستی ہے

تاج گنج

زیست سے دل خود بخود بیزار ہے
اب تو بس جینا مرا دشوار ہے

سیر ہو کر دیکھ لی سیر جہاں
چند روزہ گرمیٔ بازار ہے

مٹ گئے ہیں کیسے کیسے تاجدار
کیا کہوں یہ مشرح غم طومار ہے

دل شکن ہے بے ثباتی دہر کی
ایک برچھی سی جگر کے پار ہے

کر دیا اس غم نے دیوانہ مجھے
اب جنوں میرے گلے کا ہار ہے

آگرے میں آ کے دیکھا تاج گنج
روضۂ رضواں ہے کیا گلزار ہے

نہر میں ہے خوب فواروں کا لطف
واہ وا سو دھار کی اک دھار ہے

سرو شمشاد و صنوبر سے یہاں
پوری تشبیہ قد دلدار ہے

گل بھی اپنی وضع میں بے مثل ہیں
پھول ہے گویا جواں ہیں خار ہے

اک طرف بہتا ہے دریائے جمن
خوش ادا خوش وضع خوش رفتار ہے

دیکھ لو روضے کا گنبد دور سے
یہ جواب گنبد دوّار ہے

اوج و رفعت کی ہے یہ اونچی دلیل
سر بہ گردوں اس کا ہر مینار ہے

جب کوئی دیکھے تو پگڑی گر پڑے
پاؤں میں مغرور کی دستار ہے

سنگ مرمر کی چمک ہے دلپسند
یار کا آئینۂ رخسار ہے

سنگ موسیٰ کی یہاں دیکھی یہ رمز
آ گئے وہ جو طالب دیدار ہے

دیکھ لو سنگ طلا و سنگ سرخ
قیمتی ہے اس کی جو دیوار ہے

جا بجا ہیں بیل بوٹے خوشنما
ہر جگہ غیرت دہ گلزار ہے

در پہ ہیں آیات قرآنی رقم
یہ بڑی سرکار ہے دربار ہے

سوتے ہیں شاہ جہاں سلطان ہند
اے زباں چپ ہو ادب درکار ہے

ہند کی بیگم ہے خواب ناز میں
کس لئے یہ بے محل گفتار ہے

لوگ اس کو جانتے ہیں سیرگاہ
کیسی غفلت دیدۂ بیدار ہے

ہم نے مانا ہے یہ روضہ پُر فضا
باغ جنت کو بھی اس سے عار ہے

چشم ظاہر بیں کو دھوکا ہے فقط
یہ مقام اک مخزن اسرار ہے

یہ تو ہے دنیا کی پستی کا نشاں — وہ سمجھ جائیگا جو ہشیار ہے
غور سے پانی میں دیکھو اسکا عکس — نیچے اوپر ایک ہی مینار ہے
بادشاہِ ہند ہے بے رعب وداب — اک تماشا قبرِ پُر انوار ہے
سب چلے آتے ہیں بے خوف وخطر — تاج کیا ہے گھر ہے یا بازار ہے
جوتے لیے جاتے ہیں سب اہلِ فرنگ — اب زیادہ گفتگو بیکار ہے
اے فلک دیکھیں تری نیرنگیاں — سخت ہے ظالم جو تیرا وار ہے
تاجدارانِ جہاں یوں ہوں ذلیل — اس قدر کیوں درپئے آزار ہے
چوٹ کھائی آکے بیٹھے تاج میں — ہے جگر زخمی تو دل افگار ہے
ہیں وجاہت ماہر و دلگیر ساتھ — چُپ ہو یہ پُر درد کیا گفتار ہے

میں نے آگرے میں ایک جلسے کا تماشا بھی دیکھا۔ جو صاحبزادہ سعید الظفر خاں صاحب ڈاکٹر کی کوٹھی پر منعقد ہوا تھا بنام نہاد آگرے کے چیدہ چیدہ مسلمان شرفاء ورؤسا جمع ہوئے۔ ایک اسلامی انجمن کے ممبروں میں کچھ ناچاقی تھی اُسکے رفع کرنے اور کاروبار انجمن کو باقاعدہ چلانے کے لیے لوگوں کا اجتماع ہوا تھا۔ مغرب سے کچھ پہلے کارروائی جلسہ شروع ہوئی۔ ابتداءً تین چار اصحاب صدرِ جلسہ تجویز کیے گئے۔ مگر سب نے انکار کر دیا۔ آخر ایک مرد پاک باطن کی صدارت سے مُہرِ سکوت ٹوٹی۔ اور صاحبزادہ سعید الظفر خاں صاحب نے کچھ زبانی کچھ تحریری مضمون حاضرین کو سُنایا۔ شاہ نظام الدین صاحب دلگیر نے صاحبزادہ صاحب کی تقریر پر کچھ اعتراض کیے۔ ان کا پہلا لطیف جملہ تھا کہ "ہمارے صاحبزادے صاحب" مگر پھر فوراً ہی سنبھلے۔ اور اسکے آگے لفظ "قبلہ" بڑھا کر پورا جملہ اس طرح ادا کیا "ہمارے صاحبزادہ صاحب قبلہ نے

اس وقت جو کچھ بیان فرمایا ہے" آگرے کے ایک بوڑھے سوداگر نے اعتراض اُٹھاتے ہوئے کہا۔ کہ شاہ نظام الدین آپ کا اعتراض صحیح نہیں ہیں تو صاحب صاحب کی تقریر سُن کر ان پر عاشق ہو گیا ہوں۔ خلاصہ کلام یہ ہے۔ کہ اس جلسے میں کام کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ ایک طرف چند میزوں پر ریفرشمنٹ کا سامان چُنا ہوا تھا۔ مگر بیٹھنے کی کوئی چیز یعنی بنچ یا کرسی وغیرہ نہ تھی۔ جلسہ برخاست ہونے کے بعد اصحاب آگرہ کھڑے کھڑے نوالے کھانے پر ہاتھ مارنے لگے۔ عجب بے تکلفی کا سین تھا۔ میں احتیاط سفر کی وجہ سے اس خوان یغما میں حصّہ لے نہ سکا +

ایک روز آگرہ اخبار کا مطبع اور پریس دیکھا۔ خواجہ صدیق حسین و خواجہ تجمل حسین صاحب سے مل کر طبیعت خوش ہو گئی۔ پُرانے فیشن کے شریف ہیں +

میں آگرہ میں دیگر شعراء و اہل فن سے نہیں مل سکا۔ وجہ یہ ہوئی کہ آگرہ میں لاہور سے اصلاح سخن کی ڈاک آ گئی تھی مجھے اپریل نمبر کے لئے خود بھی مضمون لکھنا تھا۔ اور دیگر احباب کے مضامین کو ترتیب دینا تھا اس لئے سیر و تماشا چھوڑ کر اس کام میں زیادہ مصروف رہا۔ آگرہ اگرچہ پایتخت شہر ہے۔ مگر اس کے باشندوں کا زیادہ حصّہ قصباتی معلوم ہوتا ہے۔ اس شہر پر نئی روشنی کا اثر کم ہوا ہے۔ سڑکوں اور بازاروں میں ایک گھوڑے کے یکے رات دن گشت لگاتے پھرتے ہیں۔ یہ دقیانوسی سواری اب تک یہاں موقوف نہیں ہوئی۔ بازاروں میں پتھر کی چٹانوں کا فرش ہے۔ جب آدمی یکے میں سوار ہو کر چلتا ہے۔ تو پیٹ میں خوب جامنیں سی اُچھلتی ہیں

آگرہ کا ایک سین البتہ نہایت دلکش ہے۔ وہ یہ ہے کہ اسٹیشن آگرہ فورٹ شاہی قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان بنا ہے۔ جب ریل اسٹیشن کے پاس پہنچتی ہے۔ تو قلعہ و مسجد کا قابل دید و پر عبرت نظارہ ہوتا ہے۔ یہاں کا شفاخانہ بھی بہت بڑا ہے سینٹ جان کالج اعلیٰ تعلیم گاہ کے علاوہ اور چھوٹے چھوٹے کئی سکول ہیں۔ ریل کے اسٹیشن بھی سات آٹھ ہیں جن میں زیادہ مشہور یہ ہیں۔ آگرہ فورٹ۔ آگرہ روڈ۔ آگرہ عیدگاہ۔ آگرہ چھاونی۔ آگرہ جیل۔ راجا کی منڈی۔ مگر باوجود ان سب باتوں کے شہریت کی شان زیادہ نہیں پائی جاتی +

آخر میں شاہ نظام الدین صاحب دلگیر کی مہمان نوازی اور مولوی سید صادق علی صاحب پنشنر تحصیلدار کی خوش خلقی کا شکر گزار ہوں۔ کہ ان حضرات نے میری عزت افزائی فرمائی۔ رسالدار نور محمد خاں بیلی گارڈن سابق اڈیٹر آگرہ پنچ کی مہربانی بھی قابل تذکرہ ہے۔ کہ آپ میری آمد کی خبر سن کر دلگیر صاحب کے مکان پر مجھ سے ملنے آئے +

آگرہ سے ٹونڈلہ۔ دہلی بمبئی۔ اجمیر اور کانپور کو ریل جاتی ہے۔ مارہرہ سے آگرہ تک تیسرے درجے کا کرایہ ۱۴؍ ہے +

اجمیر شریف

۳۱۔ مارچ کو رات کے ۹ بجے آگرہ سے اجمیر کا ٹکٹ لیا۔ دو بجے کے قریب باندی کوئی اسٹیشن پر سب مسافر اتار دیئے گئے۔ اور کامل سات گھنٹے تک دوسری گاڑی کا انتظار کرنا پڑا۔ دن کے ۹ بجے باندی کوئی سے

دوسری گاڑی ملی شام سے کچھ پہلے جے پور کا اسٹیشن آیا۔ اگرچہ میرے پاس سیدھا اجمیر کا ٹکٹ تھا۔ مگر سو میل پر ۲۴ گھنٹہ قیام کرنے کی رعایت سے فائدہ اُٹھانا چاہا۔ اور میں جے پور اُتر پڑا۔ رات کو آگرہ سے چلتے وقت بعض خوش بُو کھانے ملے۔ اس خوشبو سے فوراً نزلہ کی تحریک ہوئی۔ اور اب میری یہ کیفیت تھی کہ آواز بالکل بیٹھ گئی خفیف سا بخار بھی ہو گیا۔ میں جے پور کے اسٹیشن پر اتر تو گیا۔ مگر جب طبیعت زیادہ مضمحل دیکھی۔ تو شہر میں جانے کی ہمت نہ پڑی۔ اجمیر جانے کے لئے اسی گاڑی میں پھر سوار ہو گیا۔ اور شام کے سات بجے اجمیر جا پہنچا۔ یہاں مسافروں کا ڈاکٹری معاینہ ہوتا ہے۔ فوراً سے پہلے پولیس کے سپاہی مسافروں کو درجوں سے اُتار کر برابر برابر کھڑا کرنے لگے۔ میں نے لاہور سے یہاں تک کسی اسٹیشن پر یہ تماشا نہ دیکھا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہاں گورنمنٹ انگریزی کی عملداری نہیں۔ بلکہ کسی غیر حکومت کا عمل و دخل ہے جو گورنمنٹ کی پالیسی کے خلاف طاعون کی روک تھام میں مصروف ہے بہرحال ڈاکٹر صاحب آ گئے۔ اور ہر مسافر کا ٹکٹ و نبض دیکھنے لگے۔ بعض محرور المزاجوں کو علیحدہ کر لیا۔ میں اس وقت بالکل مریض تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے میرا ٹکٹ و نبض دیکھ کر فرمایا کہ آپ کو بخار ہے۔ میں نے کہا۔ ہاں۔ مگر وہ شریف آدمی تھے۔ اس لئے بغیر کسی شرط کے مجھے باہر جانے کی اجازت دیدی۔ میں نے اپنا ٹرنک اور بستر قلی کو دیا۔ جب اسٹیشن سے باہر آیا۔ تو مقدس لیڈروں کی جماعت دکھائی دی یہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح کی درگاہ کے مجاور تھے۔ جو بلا کی طرح مسافروں کے پیچھے پڑتے تھے

مجھ سے بھی ایک صاحب نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ کہ حضرت کہاں جائیے گا
میں نے کہا سرا ؟ میں۔ پھر فرمایا۔ آپ درگاہ خواجہ صاحب کی زیارت
کریں گے۔ میں نے دریافت کیا۔ کون خواجہ صاحب؟ یہ خلاف امید
جواب سن کر مجاور صاحب بہت حیران ہوئے۔ اور پوچھنے لگے کہ آپ
کون ہیں۔ میں نے کہا۔ عیسائی ہوں۔ پھر مجھ سے کسی نے بات نہیں کی
میں اس وقت کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھا۔ اس لئے ان لوگوں نے میرے
قول کے مطابق مجھے بے چون وچرا عیسائی سمجھ لیا۔ یہ چال میں نے اس لئے
کی۔ کہ میری آواز نہیں نکلتی تھی۔ مجاور کو تمام رستے جواب دینا مصیبت
دردسری تھی۔ اس طرح سے پیچھا چھوٹ گیا۔

شہر اسٹیشن سے قریب ہے۔ چند منٹ کے بعد سرائے میں پہنچ کر
اسباب اتارا۔ اور مغرب کی نماز پڑھ کر کالستھ محلہ پوچھتا ہوا بابو منشی
لاتا پرشاد صاحب شاد میرٹھی کے مکان پر پہنچا۔ ان کو پہلے سے اپنی آمد
کی اطلاع نہیں دی تھی۔ اس لئے یکایک مجھے دیکھ کر بہت
متعجب ہوئے۔ اور اطلاع نہ دینے کی شکایت کرنے لگے۔ پھر
پوچھا اسباب کہاں ہے۔ میں نے کہا مسافروں کے گھر یعنی سرائے میں۔ یہ
سن کر وہ اور بھی بگڑے۔ اور یہ کہتے ہوئے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے
کہ آپ نے بڑا غضب کیا۔ چلئے پہلے وہ سرائے دکھائیے۔ اسباب
آ جانے کے بعد آپ آرام کر سکیں گے۔ الغرض شاد صاحب میرا
سامان اپنے مکان پر لوالائے۔

شاد صاحب کون بزرگ ہیں۔ اور ان سے میرے تعلقات کیسے

کیسے ہیں۔ اس کا اندازہ صرف اسی بات سے ہو سکتا ہے۔ کہ میں اور وہ لاہور کے اکثر مشاعروں میں غزلیں پڑھ چکے ہیں۔ ہر روز تو نہیں۔ البتہ دوسرے تیسرے دن میں اُن کے یا وہ میرے مکان پر گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے۔ میری اُنکی بے تکلف دوستی کا اقتضا تو یہی تھا۔ کہ میں براہ راست اُن کے گھر پہنچتا۔ مگر مکان کا پتا معلوم نہ تھا۔ مزدور کے سر پر اسباب اٹھوا کر ہر اک سے پوچھتے پھرنا کہ فلاں صاحب کا مکان کہاں ہے۔ میرے نزدیک اچھا خاصا تماشا ہے۔ لوگ اسباب و مسافر پر گہری نظر ڈالتے ہیں۔ اور آپس میں ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں۔ یہ کون شخص ہے مزدور علیحدہ پریشان ہوتا ہے۔ بعض وقت صاحب خانہ ہی موجود نہیں ہوتے۔ اس لئے مع سامان اپنا سا مُنہ لیکر واپس آنا پڑتا ہے۔ حفظ ماتقدم کے خیال سے میں نے اس سفر میں کسی کے گھر ڈھئی دینے سے پہلے سراع کا قیام مناسب تصوّر کیا ؛

اگرچہ اجمیر پہنچنے کے دن میری طبیعت زیادہ ناساز تھی۔ مگر جب تھوڑی رات گئے شاد صاحب نے مجھ سے منشی رمضان علی صاحب اختر سہارنپوری کے گھر چلنے کو کہا۔ تو میں بخوشی آمادہ ہو گیا۔ وجہ یہ تھی کہ اختر صاحب سے میری پُرانی شناسائی تھی۔ رُڑکی ضلع سہارنپور میں مجھے اور اُنہیں مہینوں ایک جگہ نشست برخاست کا اتفاق رہ چکا تھا ایسے ہمدم دیرینہ کی ملاقات سے جو خوشی حاصل ہونی چاہئے۔ اس کا اندازہ وہی لوگ بخوبی کر سکتے ہیں۔ جن کو ایسا موقع پیش آچکا ہے الغرض میں اور جناب شاد۔ اختر صاحب کے مکان پر پہنچے۔ بعد رسم سلام و

مزاج پُرسی شاد صاحب نے میری طرف اشارہ کر کے جناب اختر سے کہا۔ "آپ نے ان کو پہچانا ہے؟" اختر صاحب نے تھوڑی ہی دیر کے بعد جواب دیا۔ کہ مجھے وجاہت صاحب کا شبہ ہوتا ہے۔ یہ طریقہ "تعارف" اپنی نوعیت کے لحاظ سے نہایت دلچسپ و پُر لطف تھا۔ میں اُن کے مکان میں کمر سے تکیہ لگا کر با آرام و بے تکلف بیٹھ گیا۔ میری آواز بیٹھی ہوئی دیکھ کر اختر صاحب نے چاء تیار کرائی۔ اور بارہ بجے شب کو ہم مکان پر واپس چلے آئے ۔

اگلے روز یعنی ۲۔ اپریل کو میری طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ مگر خیر جس طرح ممکن ہو سکا میں شاد صاحب کے چھوٹے بھائی بابو بہنچی پرشاد رنگ کو ساتھ لے کر حضرت خواجہ غریب نواز رحمت اللہ علیہ کی درگاہ میں پہنچا۔ مجھے مدت سے زیارت کی تمنا تھی الحمد للہ کہ مدعا بر آیا۔ پہلے متفرق چیزیں دیکھیں۔ یعنی ہر دو مساجد۔ لنگر خانہ۔ مجلس خانہ۔ شفا خانہ۔ جھالرا۔ دو بڑی مشہور دیگیں۔ حضرت خواجہ صاحب کا روضہ۔ ان سب چیزوں کے دیکھنے میں زیادہ وقت صرف ہُوا۔ خواجہ صاحب کے مزار میں جانے اور فاتحہ پڑھنے کے لئے وقت کے علاوہ طبیعت کا بحال ہونا بھی میرے اصول کے مطابق ضروری تھا۔ اس وقت یہ دونوں باتیں مفقود تھیں۔ کیونکہ وقت تو اس وجہ سے نہیں رہا تھا کہ گیارہ بج چکے تھے۔ طبیعت پہلے ہی سے بگڑی ہوئی تھی۔ اس لئے مزار میں داخل ہوئے بغیر واپس چلا آیا۔ مگر آج جمعہ کا دن تھا۔ میں نہا دھو کپڑے بدل کر پھر خواجہ صاحب کی درگاہ میں گیا۔ اور وہیں نماز جمعہ ادا کی۔ اس مرتبہ

اندر جا کر مزار کی زیارت سے مشرف ہوا۔ اور کچھ دیر قوالی سنکر واپس چلا آیا
پھر شام تک کہیں نہیں گیا ۔

اب شعراء کو میرے اجمیر آنے کی اطلاع ہو چکی تھی۔ احباب کرم گستر تشریف لا کر ملاقات سے محظوظ فرماتے گئے۔ شاد صاحب نے میری آمد کی وجہ سے ایک مشاعرہ منعقد کرنا چاہا تھا۔ اور نوٹس بھی تقسیم کر دیئے تھے۔ مگر جب مجھے شعرائے اجمیر کی ایک کمینہ شاعرانہ رقابت کا حال معلوم ہوا۔ تو طبیعت مکدر ہو گئی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ میرے ایک خواجہ تاش منشی عاشق حسین صاحب سیماب اکبر آبادی اجمیر کے محکمۂ ریل میں ملازم تھے۔ میں جس روز اجمیر پہنچا۔ اتفاق سے وہ اسی دن چند روز کی رخصت لے کر آگرہ چلے گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد کسی چلتے پرزے نے دفتر کے افسر سے کچھ شکایت کر دی۔ افسر مذکور نے حکم دیا کہ عاشق حسین کے واپس آنے پر معاملہ پیش کیا جائے گویا مخالف شعراء نے سیماب کے روزگار کھوئے اور اجمیر سے نکلوا دینے کا سامان کیا تھا ۔

فی الحقیقت یہ ایسی کمینہ کارروائی تھی۔ کہ جس کی نظیر دنیائے شاعری میں موجود نہیں۔ مجھے اس واقعہ پر کمال افسوس ہوا۔ ایسی حالت میں مشاعرے کا تماشا کرنا فضول تھا۔ چنانچہ منشی رمضان علی صاحب اختر نے بھی یہی کہا۔ کہ اس قسم کے جلسے خوشی کے موقع پر اچھے ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ مشاعرہ ملتوی رہا ۔

۳۔ اپریل کو بیماری کی وجہ سے دن بھر پلنگ پر پڑا رہا ۔

۳ اپریل کو اتوار تھا مسٹر شاد تعطیل کی وجہ سے دفتر نہیں گئے تھے
صبح کے سات بجے بابو بھیرول پرشاد صاحب سپرنٹنڈنٹ سایر اجمیر نے
آدمی بھیجا کہ میں اور شاد صاحب تیار ہو کر چنگی کے دفتر میں آجائیں۔
سپرنٹنڈنٹ صاحب سے پہلے بھی ملاقات ہو چکی تھی۔ میں اور شاد صاحب
دفتر چنگی میں گئے۔ وہاں دروازے کے سامنے بابو صاحب کی بگھی تیار
کھڑی تھی۔ ہم تینوں آدمی اس میں سوار ہو کر سیر کو چلے۔ بابو صاحب نے
میوکالج اجمیر کی تمام عالیشان عمارتیں۔ تالاب۔ اناساگر۔ ریزیڈنٹ کی کوٹھی
اور مختلف دفاتر دکھائے۔ دس بجے کے بعد مکان پر واپس آگئے ؛
کھانا کھانے کے بعد شاد صاحب نے شیخ ضیاء الحق آف لاہور مشہور
پمفلٹ نویس کا تذکرہ کیا۔ اور کہا کہ وہ آجکل اجمیر آئے ہوئے ہیں۔ شام کو
پانچ بجے کے قریب یہاں آئیں گے۔ ہم دوپہر کو پڑ کر سو رہے۔ شام کو
اُن کے انتظار میں بیٹھے رہے۔ جب پانچ بج چکے۔ تو ایک بنگالی سا
شخص شاد صاحب کے مکان پر آکر بیٹھ گیا۔ میں سمجھا شاد کے کوئی ہندو
دوست ہوں گے۔ شاد صاحب اس وقت زنانہ مکان میں گئے ہوئے تھے
جب وہ واپس آئے۔ تو میں نے اُن سے کہا کہ شیخ ضیاء الحق صاحب ابھی
نہ آئے۔ شاد صاحب نے اُسی بنگالی سا شخص کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ
کیا بیٹھے ہیں۔ اس کے بعد میری اُن کی باقاعدہ ملاقات ہوئی۔ اور اگلے دن
دوپہر کو انہوں نے مجھے اپنے ہاں مدعو کرکے بلایا۔ شیخ صاحب تھوڑی
دیر بیٹھ کر چلے گئے ؛
رات کو ایک مسلمان شاعر صاحب کے ہاں میری دعوت تھی مجھے مضمحل

سمجھ کر اپنے مکان پر نہیں بُلایا۔ بلکہ وہ براہ عنایت کھانا شاہ صاحب ہی کے ہاں لیوا لائے۔ کھانا کھانے کے بعد وہ صاحب کہیں سے ایک بوتل بھی لے آئے۔ یہ شراب کی بوتل تھی۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ حضرت شوق فرمائیے۔ میں حیران ہو کر اُن کا منہ تکنے لگا۔ انہوں نے شاہ صاحب سے پوچھا یہ کیا بات ہے۔ شاہ صاحب نے کہا۔ آپ کا خیال غلط ہے یہ اس قسم کے مشاغل سے کوسوں دور اور سخت متنفر ہیں۔ وہ صاحب کچھ کھسیانے ہوئے میں نے کہا کچھ مضایقہ نہیں۔ آپ اور شاہ صاحب شوق سے شغل کریں۔ مجھے اس ذریعہ سے یہی معلومات ہو گی کہ اس کے پینے پلانے کے طریقوں سے آگاہ ہو جاؤں گا۔ ایک کایستھ اور مسلمان نے دور شروع کیا۔ مسلمان صاحب کورے سکورے میں پیتے تھے اور کایستھ صاحب گلاس میں۔ یہ جو کچھ ہوتا تھا ہو گذرا۔ مگر مجھے اس بات کا افسوس رہا کہ شاعر کے کیرکٹر کا اندازہ کرنے میں لوگ کیسی سخت غلطی کرتے ہیں۔

میری طبیعت بدستور خراب ہے۔ دن کو چلنا پھرنا تکلیف سے خالی نہیں معلوم ہوتا۔ مگر احباب کی تعمیل ارشاد بھی اخلاقی فرض ہے۔ آج ۵۔ اپریل کو صبح کے ۹ بجے شیخ ضیاءالحق صاحب کا آدمی مجھے بلانے آیا۔ میں اُس کے ساتھ محلہ عید گاہ میں اُن کے مکان پر گیا۔ کایستھ محلہ سے اس جگہ کو میل ڈیڑھ میل کا فاصلہ ہوگا۔ شیخ ضیاءالحق صاحب سے خوب باتیں ہوئیں۔ میں نے اُن کے اجمیر آنے کی غرض پوچھی۔ اُنہوں نے کہا۔ اخبار جاری کرنے کا ارادہ ہے۔ میں نے کہا حضرت میدان تو اچھا تاکا ہے۔ مگر پھر اُن کی گفتگو سے معلوم ہُوا کہ کمشنر نے اخبار جاری کرنے کی

اجازت نہیں دی۔ واقعی بات یہ ہے۔ کہ اجمیر کی پتھریلی زمین ایسے پودوں کی نشو و نما کے لئے موزوں نہیں ہیں میں نے شیخ صاحب کو صلاح دی کہ اگر اخبار نویسی کا ارادہ ہے۔ تو لاہور تشریف لے جائیے۔ چنانچہ انہوں نے میری رائے سے اتفاق کیا۔ اور لاہور جاکر جون ۱۹۰۹ء سے ایک روزانہ پرچہ پیشوا نام سے جاری کر دیا۔ جو دو مہینے چل کر رہ گیا +

دوپہر کو میں نے وہیں آرام کیا۔ شام کو میں اور شیخ صاحب اجمیر کی پبلک لائبریری میں جاکر دیر تک اُردو۔ انگریزی اخبارات دیکھتے رہے۔ شیخ صاحب بڑے حوصلہ و ہمّت کے آدمی ہیں۔ میں ان سے نیاز حاصل کرکے بے انتہا مسرور ہوا۔ شیخ صاحب نے مجھے اپنا فوٹو بھی عنایت کیا +

دو دن تک میری طبیعت زیادہ خراب رہی۔ میں کسی شخص کے گھر نہیں گیا۔ البتہ احباب اجمیر وقتاً فوقتاً تشریف لاتے رہے۔ میں نے غذا میں سخت احتیاط کی۔ اور چاء کا زیادہ استعمال رکھا۔ خدا خدا کرکے بیماری کا زور کم ہوا۔ ۸۔ اپریل جمعرات کا دن خواجہ صاحب کی درگاہ کے لئے وقف کیا۔ میں صبح سے گیارہ بجے تک درگاہ اور ڈھائی دن کے جھونپڑے میں رہا۔ دوپہر کو مکان پر واپس آکر سو گیا۔ اور شام کو چار بجے کے بعد پھر درگاہ میں جا کر آمد ہوا۔ رات کے دس بجے تک وہیں قیام کیا۔ قوالی بھی خوب سُنی۔ اگلے روز پھر جمعہ تھا۔ یہ گویا درگاہ میں میری حاضری کا آخری دن تھا۔ صبح کو میں نے غسل کیا۔ اور کھانا کھانے کے لئے شیخ ضیاء الحق صاحب کے ہاں گیا۔ انہوں نے آج دوسری مرتبہ دعوت کی تھی۔ اُن کے گھر سے میں اور اُن کا آدمی سیدھے درگاہ کی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنے

آئے۔ بعد نماز حسب معمول مزار خواجہ پر فاتحہ پڑھی۔ مولوی محمد حسین الہ آبادی کا مزار مبارک دیکھا۔ قوالی سنی۔ اور درگاہ کے در و دیوار پر آخری نگاہ ڈال کر واپس آیا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو خواجہ خواجگاں غریب نواز۔ سلطان الہند بھی کہتے ہیں۔ آخری خطاب کی نسبت میں اپنے مشاہدہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ حضرت خواجہ کی درگاہ میں غیر معمولی رعب جلال کے آثار پائے جاتے ہیں۔ انسان کا دل کم و بیش ضرور متاثر ہوتا ہے بعض رقیق القلب رونے بھی لگتے ہیں۔ غرض عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے۔ ایک جلیل القدر شہنشاہ کی حضوری کا سماں کھنچ جاتا ہے۔ مزار مبارک کی پائینتی تھوڑی سی جگہ کٹہرے سے خالی ہے یہاں ایک مجاور صندل لئے بیٹھے رہتے ہیں۔ زائرین اس جگہ سر جھکاتے ہیں۔ بوسے دیتے ہیں۔ اور بعض جوش عقیدت میں سجدہ کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ اہل شریعت اس کو شرک قرار دیتے ہیں۔ میں نے صرف فاتحہ پڑھی اور کچھ دیر قیام کر کے باہر چلا آیا۔ صندل بطور تبرک تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کے معاوضے میں مجاوروں کو بہت کچھ مل رہتا ہے۔ مجاور صاحب نے مجھ سے بھی کچھ لینے کی خواہش کی۔ میں نے کہا بھئی۔ یہ سلطان الہند کی درگاہ ہے۔ میں یہاں سے کچھ لینے آیا ہوں۔ دینے نہیں آیا۔

جمعرات کی شام کو اور جمعہ کی نماز کے بعد درگاہ میں قوالی ہوتی ہے۔ یہاں کے قوال صرف ڈھولک ستار سے کام لیتے ہیں۔ سارنگی نہیں بجاتے۔ خواجہ صاحب کے مزار اور دیگر عمارات خانقاہ پر لاکھوں روپیہ صرف ہوا ہے۔ اب بھی یہاں کے اخراجات کا تشاہا ؟ اندازہ ہے مہر روز

جو کا دلیا لنگر کے طور پر تقسیم ہوتا ہے۔ چوبدار عصا بردار۔ سفید و مہذّب لباس زیب تن کئے۔ سنہرے۔ رُپہلے قلم ہاتھ میں لیئے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کو دیکھ کر شاہی زمانہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے +

خانقاہ میں جمعہ کی نماز بھی شاہانہ شان سے ادا ہوتی ہے۔ اذان سے لیکر سلام پھیرنے یعنی ختم نماز تک متعدد گولے چلتے ہیں +

یہاں کے مجاوروں کا طریق عمل سخت ناپسندیدہ ہے۔ یہ لوگ بلا کی طرح مسافر کے سر ہوتے ہیں۔ اور اُسے بالکل لوٹ لینا چاہتے ہیں۔ ایسی عالی شان سرکار میں ایسے کمینہ خصایل خدّام کا کیا کام۔ عقیدت پسند بے طلب بھی ان کی خدمت کرتے ہیں۔ نا ہنجار مانگنے سے بھی نہیں دیتے۔ پھر یہ لوگ مفت کیوں بدنام ہوتے ہیں۔ سنا ہے مجاوروں کی چالاکیوں کے سبب سے اجمیر کے ریلوے سٹیشن پر پلیٹ فارم کا ٹکٹ ملنا بھی موقوف ہو گیا۔ یہ لوگ دو دو پیسے کے چند ٹکٹ لے کر پلیٹ فارم پر چلے جایا کرتے تھے۔ اور باہر سے آنے والے مسافروں کو ان کے ذریعہ اسٹیشن سے نکال لاتے تھے۔ میں نے خواجہ صاحب کی شان میں چند شعر لکھے غریب شاعر اس کے سوا اور کیا نذر کرتا ۔

تمہیں ہو ہندوستاں کے سرورِ غریب پرور حضور خواجہ
غریب و بیکس ہوں میں سراسر کرم ہو مجھ پر حضور خواجہ
شریف ہوں میں غریب ہوں میں مگر عجب بد نصیب ہوں میں
شکستہ پر عندلیب ہوں میں چمن میں مضطر حضور خواجہ
مجھے تو ہے آسرا تمہارا نگاہِ الطاف ہو خدارا

پھروں نہ یوں اب تو مارا مارا بحالِ ابتر حضورِ خواجہ
بنائے گردوں نے حال کیا کیا دکھائے رنج و ملال کیا کیا
کیا مجھے پائمال کیا کیا دیئے ہیں چکّر حضورِ خواجہ
غضب کا ہے چار سو اندھیرا عجیب ظلمت نے مجھکو گھیرا
کہیں ٹھکانا نہیں ہے میرا جہاں کے اندر حضورِ خواجہ
ہمارے پشت و پناہ تم ہو کہ ہند کے بادشاہ تم ہو
بجا ہے ظلِ الٰہ تم ہو ہمارے سر پہ حضورِ خواجہ
خدا کے بندے خدا کے پیارے بڑی مصیبت میں ہیں گنہگار
سوا تمہارے کسے پکارے یہ زار و مضطر حضورِ خواجہ
تمام عالم میں پھر پھرا کر تمہارے در پہ پڑا ہوں آ کر
اٹھونگا اب تو مراد پا کر یہ در ہے یہ سر حضورِ خواجہ
عجب یہ دربارِ خسروی ہے یہاں کسی شے کی کیا کمی ہے
مرے لئے دیر کیوں لگی ہے غریب پرور حضورِ خواجہ
ہزار ولیوں کے اک ولی ہو۔ تم آلِ پیغمبر و علیؓ ہو
بڑے دھنی ہو بڑے بلی ہو مثالِ حیدر حضورِ خواجہ
معین دنیا معین دیں ہو کہ نائبِ ختمِ مرسلیں ہو
تمہیں ہو سرکار بس تمہیں ہو خدا کے مظہر حضورِ خواجہ
ہوا ہوں بیزار زندگی سے گزرنے والا ہوں اپنے جی سے
یہ راز سربستہ ہے کسی سے کہوں تو کیونکر حضورِ خواجہ
دیا ہے آزار آسماں نے نہ چین لینے دیا جہاں نے

غرض ہر اک یار و مہرباں نے چلائے خنجر حضور خواجہ
تمہاری سرکار ہے وہ عالی گیا نہ کوئی یہاں سے خالی
بس اپنے دل کی مراد پائی سبھی نے آکر حضور خواجہ
اُٹھائی ہے ہر جگہ مصیبت تمہارے در پر ملی ہے راحت
بتاؤ جائے کہاں وجاہت یہاں سے اُٹھ کر حضور خواجہ

نواب محمد شمس الدین علی خاں صاحب عاشق رئیس اعظم اجمیر شریف سے ملاقات ہوئی نواب صاحب نہایت خلیق و جوان صالح ہیں۔ آپ حضرت داغ و مولانا ظہیر دہلوی کے شاگرد ہیں۔ دیوان چھپ چکا ہے۔ اس کی ایک جلد مع دو تصاویر مجھے بھی عنایت فرمائی +

منشی رمضان علی صاحب اختر سہارنپوری انہیں نواب نامدار کے کامدار ہیں۔ ان کے یعنی اختر صاحب کے ہاں تفریح طبع اور دل بہلاؤ کا اچھا سامان رہتا ہے۔ ہارمونیم۔ طبلہ۔ ارباب نشاط غرض زندہ دلی کی سب باتیں موجود ہیں خصوصاً ایک پرانے بیت باز میاں فیضی صاحب دل لگی کا اچھا ذریعہ ہیں اجمیر میں منشی رمضان علی صاحب۔ اختر منشی محمد وزیر صاحب بصر کلرک آڈٹ آفس و منشی محمد ایوب صاحب باغ اور بابو بھیروں پرشاد صاحب سپرنٹنڈنٹ چنگی نے خوب مہماں نوازی کی میں ان جملہ حضرات کی مہربانی کو ہمیشہ یاد رکھونگا۔ منشی للتا پرشاد صاحب شاد میرٹھی نے باوجود ہندو ہونے کے میری تواضع و مدارات میں جو خاص اہتمام و تکلف کیا۔ اس کا نقش میرے دل سے کبھی نہیں مٹ سکتا۔ حکیم بہاء الدین خاں صاحب بہا۔ حکیم رام نراین صاحب چیراں دہلوی اور میاں قاتل لکھنوی سے بھی ملا تھا

ہوئی۔ شیخ محمد علی صاحب میر احدی بھی مجھے عرصہ تک یاد رہیں گے۔ یہ صاحب
جب میرے پاس آتے تھے۔ تو اٹھنے کا نام نہ لیتے تھے۔ اس لئے میں ان کو
میر عہدی کہا کرتا تھا۔ آگرہ سے اجمیر کا کرایہ ۳؎۸ ہے۔ یہاں بچھو بہت ہوتے
ہیں۔ پانی گدلا جیسی پر سفید گلاس میں کھانڈ کے شربت کا شبہ گزرتا ہے

جودھپور

۱۲ اپریل ۱۹۰۹ء دوشنبہ کے دن رات کے ۹ بجے اجمیر سے روانہ
ہوا۔ راستے میں مارواڑ جنکشن پر گاڑی بدلنی پڑی۔ قرنطینہ کا جھگڑا یہاں
بھی تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے میرا ٹکٹ و نبض دیکھ کر پوچھا کہ آپ اجمیر میں کہاں
سے آئے تھے۔ میں نے کہا آگرہ سے۔ پھر پوچھا جودھپور کتنے روز قیام
ہوگا میں نے جواب دیا ایک ہفتہ۔ یہ سن کر میرا ٹکٹ واپس دے دیا
مارواڑ جنکشن پر ۱۲ بجے رات کے پہنچا۔ تین گھنٹے مسافر خانے میں گذارے
چار بجے جودھپور بیکانیر ریلوے میں سوار ہوا۔ اور ۹ بجے دن کے
جودھپور جا پہنچا۔ فیاض صاحب فاروقی کو پیر کے روز پہنچنے کی اطلاع دی
تھی۔ آج منگل تھا۔ اور اُس وقت جودھپور میں صبح کی کچہری ہوتی تھی۔
فیاض صاحب کے اسٹیشن پر آنے کی کوئی امید نہ تھی۔ چنانچہ میں اُترا۔ تو
اُنہیں موجود نہ پایا۔ مسافر ٹکٹ دے کر پھاٹک سے گزرنے لگے۔
یہاں بھی طاعون کی جانچ پڑتال ہوتی تھی۔ میری طبیعت قدرے
ناساز تھی۔ جب میں نے ٹکٹ دکھایا تو ڈاکٹر نے مجھے مریض مسافروں
میں کھڑا کر دیا۔ جب سب مسافر نکل گئے۔ تو مریض مسافروں کی باری آئی

اسی اثنا میں منشی فیاض احمد صاحب فاروقی اور منشی رحیم بخش صاحب محافظ دفتر فوجداری بھی اسٹیشن پر آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے میرا نام لکھ کر ہدایت کی۔ کہ تین روز تک شفاخانے آ کر نبض دکھا جایا کرو (میں صرف ایک دن گیا) آگے چنگی والوں نے روک لیا۔ ٹرنک کھلوا کر دیکھا۔ لاہور سے یہاں تک یہ پہلا موقع تھا۔ کہ میرا اسباب کھلوا کر دیکھا گیا۔ میں نے خیال کیا۔ کہ یہ ریاست کا معاملہ ہے۔ یہاں کے اہلکار تھوڑی پونجی کی وجہ سے زیادہ چوکسی کرتے ہیں۔ اسٹیشن کے احاطہ سے باہر نکل کر اسباب قلی کے سر پر رکھوایا۔ اور میں ہمراہی منشی فیاض احمد صاحب و منشی رحیم بخش شہر کی طرف روانہ ہوا۔ فیاض صاحب کا مکان اسٹیشن سے زیادہ دور نہیں۔ اس لئے ہم سب جلد پہنچ گئے۔

میرے آنے کی خبر سن کر تھوڑی دیر کے بعد مولوی محمد عبدالحی صاحب بیخود بدایونی سپیشل مجسٹریٹ ریاست جودھپور کچہری سے سیدھے فیاض صاحب کے مکان پر آ کر مجھ سے ملے۔ گرمی کا وقت تھا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر دولت خانہ کو تشریف لے گئے۔

منشی فیاض احمد صاحب فیاض فاروقی میرے ہم وطن ہیں۔ ان کا مکان جھنجھانہ سے دو کوس جانب شرق موضع پٹرانہ میں ہے۔ فیاض صاحب نے جھنجھانہ میں تعلیم پائی۔ گو میں اور وہ ہم سبق نہیں رہے۔ مگر ملاقات کا سلسلہ مدت سے ہے یعنی اس وقت سے کہ فیاض صاحب کو مضمون نویسی اور شعر گوئی کا بھی شوق نہ تھا۔ اگرچہ فیاض صاحب میرے رشتہ دار نہیں۔ مگر میرے ان کے تعلقات رشتہ داروں سے زیادہ گہرے ہیں یہ پہلا موقع تھا۔ کہ میں جودھپور میں ان کے ہاں مقیم ہوا۔ فیاض صاحب کا

مکان گزرگاہ ہے۔ اکثر اہلکار انہیں کے ہاں ٹھہرتے ہیں۔ دوپہر کے بعد لوگوں کی آمد شروع ہوئی۔ رات کے گیارہ بجے تک اچھا مجمع رہا۔ کئی روز کے تجربہ سے معلوم ہوا کہ فیاض صاحب کا مکان اہل محلہ و دیگر احباب کی نشست گاہ ہے۔ حضرت مولانا مولوی محمد عبدالحی صاحب بیخود اور منشی فیاض احمد صاحب فاروقی صرف یہ دو صاحب جو دھپور میں ایسے تھے۔ جن کی ہم بزمی سے جی نہ گھبراتا تھا۔ مغرب کے بعد میں اور فیاض صاحب مولانا بیخود کے دولت کدہ پر چلے جاتے یا ہم کسی وجہ سے نہ جا سکتے۔ تو مولانا خود تشریف لے آتے شعر و سخن کے خوب چرچے رہتے تھے۔ ایک روز اتوار کے دن مولوی بیخود صاحب کے فرزند اکبر رضا حسین صاحب نے مجھ سے کہا کہ یہاں مسلمانوں کی ایک انجمن بنام اصلاح المسلمین قایم ہے۔ اُس کے متعلق ایک کلب ہے۔ آج شام کو سات بجے اُس کا جلسہ ہونے والا ہے۔ اگر ممکن ہو سکے تو آپ بھی کچھ لکھئے۔ میں نے کہا ٹھیک وعدہ تو نہیں کرتا۔ اگر ہو سکا تو کچھ لکھ لونگا۔ کسی قدر فکر کرنے سے مندرجہ ذیل اشعار موزوں ہو گئے ۔

پنجاب کی طرف سے میں آیا ہوں مارواڑ
مجھ کو نظر نہ آئی تری تازگی کہیں
جنگل میں بھی یہاں کے نہیں کوئی دلکشی
تشبیہ دیتے اس کو زمینِ عرب سے ہم
آباد خیر سے ہیں مسلمان بھی ۔ مگر
کھلتا نہیں ہے ان کا مقدر ہزار حیف
نہ خانے میں گزارتے ہیں اپنی زندگی

دیکھے قدم قدم پہ یہاں راہ میں پہاڑ
ڈالی جدھر نگاہ دکھائی دیا اُجاڑ
البتہ کھینچ لیتے ہیں دامن پکڑ کے جھاڑ
لیکن یہاں کھجور ہے کوئی نہ کوئی تاڑ
ہر اک بُری طرح سے رہا ہے انہیں لتاڑ
سختی سے بند ہیں درِ تقدیر کے کواڑ
غفلت سے انکی آنکھوں کے آگے لگی پہاڑ

کم زور ہیں یہاں کے مسلماں ضعیف ہیں
بے طرح کھا کے گر گئے میدان میں پچھاڑ

اب تک فضول وقت گزاری سے کام ہے
دلی میں جھونکتے ہیں جو بارہ برس سے بھاڑ

اصلا نہیں زمانے کی رفتار پہ نظر
ہاں اس کو اور تاڑنے والے گئے ہیں تاڑ

یہ اپنے ہاتھ پاؤں ہلاتے نہیں ذرا
ٹلتا نہیں ہے اپنی جگہ سے کبھی پہاڑ

دامانِ زندگی کی اڑاتے ہیں دھجیاں
کرتے ہیں خوب جامۂ ہستی کی چیر پھاڑ

تعلیم سے ہے انکو تنفر غضب غضب
افسوس ہے بناؤ کو سمجھے ہیں یہ بگاڑ

ہر قوم اب ہے راہِ ترقی میں تیز گام
میداں میں علم و فضل کے جھنڈے دیئے ہیں گاڑ

واللہ کاہلی کا زمانہ نہیں ہے اب
شہ زور جو ہے دے گا وہ کم زور کو پچھاڑ

کب تک رہے گا طایرِ دل تو قفس میں بند
اب تیلیوں کو توڑ پھڑک کر پروں کو جھاڑ

ہستی ہے کیا قفس کی تو ہمت سے کام لے
بس تیری کاہلی نے لگا رکھی ہے یہ آڑ

بے ہمتی و بے خبری کا نہیں یہ وقت
کوشش سے کاٹ ڈالتا ہے آدمی پہاڑ

ہم مانتے ہیں اور حکومت ہے اس جگہ
ہم جانتے ہیں غیر علاقہ ہے مارواڑ

لیکن اگر ہم اپنی مدد آپ کر سکیں
تو اس میں دوسروں کا ہے کیا ہرج کیا بگاڑ

افسوس ہے یہ اگلے زمانے کے لوگ ہیں
اچھی نہیں ہے ان سے وجاہت یہ چھیڑ چھاڑ

یہ نظم جودھپور میں عموماً ناپسند کی گئی۔ سد رضا حسین صاحب نے اس کے چند اشعار پر تضمین بھی لکھی تھی +

میرا ارادہ جودھپور میں ایک ہفتہ ٹھہرنے کا تھا۔ مگر فیاض صاحب نے مجھے تین ہفتے تک نہ ہلنے دیا۔ جب چلنے کی تیاری کی جاتی فیاض صاحب دو روز اور ٹھہرا لیتے۔ کئی مرتبہ ایسا ہی اتفاق ہوا۔ ادھر مخدومی مولانا بیخود کی بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی و سخن آرائی نے دل کو مسخر کر لیا۔ ان کے پاس

بیٹھ کر اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا - آپ نے شعر و سخن کے متعلق عجیب و غریب لطیفے سنائے تفنن طبع ناظرین کے لئے ایک لطیفہ یہاں بھی درج کیا جاتا ہے*
لطیفہ - مولانا فرماتے تھے - کہ جب حضور پرنس آف ویلز جودھپور تشریف لائے - تو کوئی بے مغز شاعر ایک قصیدہ کہہ کر لایا - اُس کا مطلع تھا ؎

ہُوا وخول جو شہزادہ جودھپور کے بیچ   خوشی گھُسی ہے ہمارے سری حضور کے بیچ

مولانا کو صرف مطلع ہی یاد تھا - باقی اشعار کا بھی اسی پر اندازہ ہو سکتا ہے - راج کی طرف سے اس قصیدے کے صلے میں شاعر صاحب کو ۵ دیئے گئے*

فیاض صاحب کی زبانی ایک عجیب قصہ معلوم ہوا - وہ یہ کہ جشن مسند نشینی مہاراجہ کے موقع پر دہلی اور پنجاب کے بعض اخبار نویسوں نے ریاست کو لکھا کہ ہم ریاست کے بہی خواہ ہیں - اس مبارک تقریب پر ہمارا مدعو ہونا ضروری ہے - پنڈت سکھ دیو پرشاد صاحب سینیر ممبر ریاست نے ان کی اس انوکھی درخواست پر لکھ دیا - کہ آپ شوق سے آئیے - چنانچہ بعض اڈیٹر صاحبان بے تکلف جودھپور آدھمکے ریاست نے ان کی رسد وغیرہ کا انتظام کر دیا - اور آخر میں ان کو شوکھا ہی ٹالنا چاہا - اس پر اڈیٹر صاحب سٹ پٹائے - اور نہایت شوخ چشمی سے دست سوال دراز کیا - پنڈت سکھ دیو پرشاد صاحب نے کہا کہ آپ ریاست کے مہمان ہو کر آئے ہیں - اگر آپ اپنے کسی مہمان کو بحیثیت میزبان کچھ دیتے ہوں - تو ایسا کرنے میں ہمیں بھی عذر نہیں - آخر بڑی جدّ و جہد کے بعد یہ خوش غلاف گداگر کچھ دے دلا کر رخصت کئے گئے - اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے - کہ ہندوستانی اخبار نویسوں کی حالت

بہت کچھ محتاج اصلاح ہے بعض کم مایہ اڈیٹروں نے اس معزز فن کو بُری طرح بدنام کر رکھا ہے +

مولانا بیخود استاد داغ مرحوم کے پرانے اور کہنہ مشق شاگرد ہیں۔ جملہ خانہ ساز جانشینان داغ سے آپ کا کلام ہر طرح فایق ہے میں نے کہا حضرت آپ نے جانشینی کا دعوے نہیں کیا۔ فرمانے لگے اس سے کیا حاصل۔ البتہ اگر حضور نظام مجھے اتنی ہی تنخواہ دینے لگیں۔ جتنی استاد مرحوم کو ملتی تھی۔ تو محض دنیوی فایدے کے خیال سے میں یہ زحمت گوارا کر سکتا ہوں۔ ورنہ فضول پاپڑ بیلنا دانشمندی کے خلاف ہے +

مولانا ممدوح کو کلام سننے اور خصوصًا سنانے کا بہت شوق ہے حتیٰ کہ ایک بیاض کچہری میں بھی آپ کے ساتھ رہتی ہے میں ایک دفعہ آپ کے اجلاس مجسٹریٹی میں گیا۔ تو آپ نے وہ بیاض نکال کر سامنے رکھ دی۔ ابھی آپ کا دیوان شایع نہیں ہوا۔ مگر آپ اس کی اشاعت کی فکر میں ہیں۔ شاگردان داغ میں مولانا کا دم بسا غنیمت ہے۔ آپ نہایت خلیق طلیق اللسان و شیریں بیان سخنور ہیں۔ مجھے آپ سے نیاز حاصل کرنے کا ہمیشہ فخر رہے گا +

جودھپور ہندوستان کی مشہور ریاست ہے۔ پنڈت سکھ دیو پرشاد صاحب سینیر ممبر اعلیٰ درجہ کے بیدار مغز و منتظم ہیں۔ ریاست کے علاقے میں مور اور کبوتر شکار کرنے کی ممانعت ہے۔ اس لئے یہ جانور یہاں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ جودھپور کی کچہری نہایت عالی شان ہے اور مکان عمومًا پتھر کے ہیں۔ منشی فیاض احمد صاحب کے مکان پر

احباب کا اچھا مجمع رہتا ہے۔ میں جب تک رہا دوسرے تیسرے دن دوروپیہ کے لڈو سوہنیلا آتے رہے۔ جو مجھے عرصہ تک یاد رہیں گے +
جودھپور اور گور کے عدد برابر ہیں جس طرح گور سے نکلنا ناممکن ہے اسی طرح میں بھی جودھپور جاکر زندہ درگور ہوگیا۔ بڑی مشکل سے جان سلامت لے کر بھاگا +

منشی فیاض احمد کے ہاں تو میں مہمان ہی تھا۔ ان کے علاوہ مولوی محمد ادریس صاحب وکیل۔ منشی رحیم بخش صاحب محافظ دفتر اور حضرت مولانا بجھو دنے بھی مہمان نوازی میں حصّہ لیا۔ مولانا کے ہاں محفل میلاد میں بھی ایک آدھ مرتبہ شامل ہونے کی عزّت حاصل ہوئی۔ بابو ظفر احمد صاحب کلرک۔ مجھو خاں صاحب وکیل۔ منشی نثار احمد خلف منشی غیور احمد مرحوم اور بھائی عبدو کی خوش مذاقی و خوش اخلاقی میں کبھی نہ بھولونگا۔ ان حضرات کی خوش مزاجی ہی کا سبب تھا۔ کہ میں اتنے دن جودھپور میں دل لگا کر رہا۔ اجمیر سے جودھپور کا کرایہ براہ مارواڑ جنکشن بھر ہے۔ مگر دہلی سے جودھپور آنے والوں کو پھلیرا جنکشن سے گاڑی بدلنی پڑتی ہے +

احمدآباد

میں ۳۔ مئی کو شام کے ۶۔ بجے جودھپور اسٹیشن سے سوار ہوا۔ اکثر احباب پلیٹ فارم تک الوداع کہنے آئے۔ گیارہ بجے مارواڑ جنکشن پہ گاڑی تبدیل کرنے کی غرض سے اترنا پڑا۔ بارہ بجے کے بعد اجمیر سے

پسنجر ٹرین آئی۔ میں اس میں سوار ہوگیا۔ رستے میں پہاڑوں اور غیر آباد جنگلوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ البتہ پالن پور پہنچ کر حالت بدل گئی۔ کیونکہ مارواڑ کا علاقہ ختم ہوکر گجرات کی حد آگئی تھی۔ پالن پور کی سرزمین میں لنگور بکثرت دیکھے۔ اسٹیشن تک کی دیواروں پر کودتے پھرتے تھے۔ یہ خطہ آباد و سرسبز ہے۔ میں ۴ مئی کو شام کے چار بجے احمد آباد پہنچا۔ اسباب سرائے میں رکھ کر رسالہ تحفہ احمد آباد کے دفتر میں گیا۔ وہاں سے اپنی ڈاک حاصل کی۔ اس کے بعد عاشق صاحب مہتمم رسالہ تحفہ احمد آباد میرے ساتھ شیخ محمد عثمان صاحب شاد پونوی کے مکان پر آئے۔ اور مجھے شعرائے احمد آباد سے ملایا۔ شاد پونوی نے اسی وقت گاڑی منگائی۔ اور مجھے ہمراہ لیکر سرائے سے میرا اسباب اپنے مکان پر اٹھا لائے۔ منشی عبدالکریم صاحب جوش اور منشی حسن جان شتاب سندیلوی شاد صاحب کے مکان پر ہر وقت میری رفاقت میں رہے +

میں نے شام تک بعض احباب کو خطوط کے جواب لکھے۔ رات کو دیگر شعرائے احمد آباد وقتاً فوقتاً مجھ سے آکر ملے۔ شیخ غلام رسول صاحب متخلص بہ ادا نے میرے احمد آباد آنے کی یادگار میں مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ کہا ؎

زہے جناب وجاہت حسین مرد حسیں	بباغ شہر جناں نوبہار خوش آمد
بسال جلوہ فروزی آں زغور ادا	بگفت انچہ بصد جاہ یار خوش آمد

ادا صاحب پرانے بزرگ ہیں۔ انہوں نے اس تاریخ میں احمد کے الف کے دو عدد لئے ہیں۔ جو اگرچہ فی زمانا متروک ہیں۔ مگر پرانے شاعروں کے کلام میں اس کی بکثرت نظیریں ملتی ہیں۔ اس لئے کچھ مضائقہ نہیں +

۱۶ مئی جمعرات کے دن منشی حسن جان بتیاب منشی غلام حیدر صفدر گھڑ یسائی منشی عبدالکریم جوش احمد آباد کے اسٹیشن ایلس برج سے مجھے مقام سرخیز لیگئے یہ جگہ احمد آباد سے ۵ میل کے فاصلہ پر ہے یہاں کئی بزرگوں کے مزار ہیں۔ جمعرات کے دن احمد آباد سے بہت آدمی بغرض زیارت و فاتحہ جاتے ہیں۔ اس روز ریلوے اسٹیشن سے لوگوں کو واپسی ٹکٹ ملتا ہے اس میں ایک پیسے کی رعایت ہوتی ہے۔ معمولی کرایہ ۱ ہے۔ واپسی ٹکٹ ۲ کو ملتا ہے۔ سرخیز بی بی اینڈسی۔ آئی۔ آر کا اسٹیشن ہے اور یہ وہ لائن ہے جو احمد آباد سے دھولکا کو جاتی ہے۔ ہم تھوڑی دیر کے بعد سرخیز پہنچ گئے اسٹیشن سے میل ڈیڑھ میل پیدل چل کر بابا علی شیر قدس اللہ سرہٗ کا مزار مبارک آیا۔ دروازۂ خانقاہ پر گل فروش سے کچھ پھول خرید کر درگاہ میں گئے۔ وہاں فاتحہ پڑھی اور کچھ دیر ادھر اُدھر ٹہل کر عمارات و مناظر کا معاینہ کیا۔ اس مزار کے احاطہ میں مغرب کے بعد کوئی متنفس ٹھہرنے نہیں پاتا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ دن چھپے یہاں ایک شیر آتا ہے۔ اُسکے خوف کی وجہ سے سب لوگ شام سے پہلے ہی خانقاہ چھوڑ دیتے ہیں۔ ممکن ہے یہ بات صحیح ہو۔ مجھے اس کی جانچ کا موقع نہیں ملا +

یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک بزرگ حضرت گنج احمد شاہ صاحب کا مزار مقدس ہے۔ خانقاہ کا احاطہ نہایت وسیع و بارونق ہے۔ مختلف اقسام کی اشیاء خوردنی۔ برف۔ سوڈا لیمونیڈ۔ شربت۔ چاء۔ کافی پان غرض کھانے پینے کی سب چیزیں بافراط فروخت ہوتی ہیں۔ زیرین مزار شاہجہان زمانے کا ایک لمبا چوڑا تالاب ہے۔ خانقاہ کے دریچوں سے

پانی کا نظارہ نہایت دلکش معلوم ہوتا ہے۔ یہاں رنڈیاں بھی مجرا کرتی ہیں اور یار لوگوں کو اس مقدس مقام پر دل لگی کی سوجھتی ہے۔ ہم بارہ بجے سے شام کے ۵ بجے تک یہاں رہے۔ چھ بجے سرخیز اسٹیشن سے سوار ہوکر احمدآباد واپس چلے آئے۔

اگلے روز ایک کپڑے کا کارخانہ موسوم بھرت کھنڈ مل دیکھا۔ منشی عبدالحکیم صاحب نثار شاگرد جناب نوح ناروی اس مل میں ملازم ہیں۔ انہوں نے انجن گھر اور کپڑا بُننے کی چلتی ہوئی مشینیں مجھے دکھائیں۔ سینکڑوں ملازم کام پر لگے ہوئے تھے۔ اور ہزاروں کلیں چل رہی تھیں۔ طلسم کا عالم تھا جس وسیع ہال میں کپڑا بنا جاتا تھا۔ اس کے اندر مجھے غیر معمولی گرمی محسوس ہوئی۔ اس لئے دوسرا کارخانہ دیکھنے کی جرأت نہ ہوسکی۔

۸۔ مئی سنیچر کی شام کو مشاعرہ تھا۔ اس کے نوٹس دو تین روز پہلے تقسیم ہوچکے تھے مضمون یہ ہے:۔

مقام
احمدآباد۔ پان کورنگ
انجمن تہذیب سخن

تاریخ
۸ر مئی ۱۹۰۹ء

جناب من

تسلیم۔ عرض خدمت میں یہ ہے کہ اتفاق وقت سے مخدومی مکرمی حضرت منشی وجاہت حسین صاحب وجاہت اڈیٹر اصلاح سخن لاہور سے تشریف لائے ہیں۔ لہذا میں نے ذیل کے مصرع پر مشاعرہ قرار دیا ہے۔ امید ہے کہ شریک جلسہ

ہو کر داعی کو ممنون فرمائیں۔ مصرع طرح ؎

قتلِ تیغِ ابروِ یار و گدا یہ بزمِ ماتم ہیں۔ ماتم قافیہ

مجھے مصرع کے صحیح غلط یا اچھے بُرے ہونے سے بحث نہ تھی۔ میں نے مذاقاً کہا۔ کہ جودھپور سے احمد آباد کا سفر اتنا لمبا نہیں۔ جتنا یہ مصرع طویل ہے۔ بہرحال میں نے دو غزلیں لکھیں۔ اور مشاعرہ میں پڑھیں۔ ملاحظہ ہوں ؎

ستم کے تم جو عادی ہو تو ہم بھی خوگرِ غم ہیں
لحد میں بے سر و ساماں ہیں چھپے شاہانِ عالم ہیں
زمانے پر ستم پیہم فلک کے اب بھی کیا کم ہیں
بگڑ بیٹھے ہیں کہتے ہیں کہ ناگن کیوں کہا تم نے
تماشے حسن کے دیکھے ہیں یکساں دیدہ و دل نے
نہیں چھوڑے سجاتے جام صہبا ہاتھ میں لے کر
ملک بھی آ دبوچے سے یہ چھوڑو ناز کی باتیں

جفائیں جتنی ہوں تھوڑی ہیں جتنے ظلم ہوں کم ہیں
نشاں تک مٹ گئے باقی علم ہیں اب نہ پرچم ہیں
یہ بوڑھا ہو گیا لیکن وہی کس بل ہیں دم خم ہیں
وہ اپنی زلف کی تعریف سُن کر مجھ سے برہم ہیں
محبت میں یہی دونوں مرے ہمراز و ہمدم ہیں
یہ رندانِ خراباتی بھی اپنے وقت کے جم ہیں
جو ہم ہیں بس وہی تم ہو جو تم ہو بس وہی ہم ہیں

. . . .

شبِ وعدہ وہ آئینگے نہ آئینگے نہ آئینگے
بلا خوش ہونے کا موقع ہے کب مرگِ دشمن پر
کسی بے رحم کے پھندے سے چھوٹ کر آئے ہیں شاید
کیا ہے مجھکو پامال اُس مہ رو کی اُلفت نے
شبِ وعدہ جو آئے ہو تو کُھل کھیلو ہنسو بولو
ترسے کیوں جیسے کی جنت میں ہمیشہ رہ نہیں سکتے

یہ دل اُن کے سبب تفکر ہیں چل ہی جانے ہیں ہم ہیں
تمہارا رونا پڑا ہے وہ شریکِ بزمِ ماتم ہیں
تمہارے ہونٹ بھی سوکھے ہیں کچھ آنکھیں بھی پُرنم ہیں
کہ جتنے داغ ہیں دل پر وہ سب بیمار و برہم ہیں
حیا کس سے ہے بس ہیں تو تمہیں تم ہو ہمیں ہم ہیں
نکالے جائینگے آخر کہ ہم فرزندِ آدم ہیں

کہو اپنے بے وفا دونوں میں ثابت کون ہوتا ہے
ہمارا قول ہے تم ہو تمہارا قول ہے ہم ہیں

وجاہت احمد آباد آکے جی خوش ہو گیا اپنا
یہاں کے آدمی خوش طبع ہیں خلق مجسم ہیں

ہمیں مطلب؟ جو ہر سو یادگار بزم ماتم ہیں
کہ اس کے چار آنسو یادگار بزم ماتم ہیں

پریشانی بڑھی ہے ہو بہو دشمن کے مرنے سے
کسی کے لٹتے گیسو یادگار بزم ماتم ہیں

مرا قاتل بھی شامل ہے اسے دیکھو عزادارو
کہ وہ اور اس کے ابرو یادگار بزم ماتم ہیں

جب آئی موت دشمن کی کہا اس شوخ نے ہنس کے
لپٹ کر رو رہیں تو یادگار بزم ماتم ہیں

مرے پھولوں میں بیٹھے پھونکتے ہیں کچھ وہ پڑھ پڑھ کر
یہ افسوں اور جادو یادگار بزم ماتم ہیں

ہوا ہے بلبل ناشاد کا گلشن میں دم آخر
بس اب کیا ہے گل و بو یادگار بزم ماتم ہیں

عدو کے سوگ میں بگڑا ہے نقشہ انکی آنکھوں کا
خدا کی شان آہو یادگار بزم ماتم ہیں

پریشاں انکی زلفیں ہیں دل مرحوم کے غم میں
مسلمانو یہ ہندو یادگار بزم ماتم ہیں

گل عارض کا عاشق مر گیا یہ سوگ ہے اسکا
زمانے بھر کے گلرو یادگار بزم ماتم ہیں

بجا ہے جیسے مرنے سے کھلا ہے بال بال انکا
یہ سچ ہے تیرے گیسو یادگار بزم ماتم ہیں

عدو سے ملتے ہیں لپٹے ہیں جیسے سوگواروں سے
یہ ان کے چند پہلو یادگار بزم ماتم ہیں

نہایت دھوم سے سب نے منایا سوگ عاشق کا
حسینان پری رو یادگار بزم ماتم ہیں

نگاہ غور سے دیکھو نشاں ہیں مٹنے والوں کے
کھنڈر جتنے ہیں ہر سو یادگار بزم ماتم ہیں

وجاہت میری میت پر جو نکلے انکی آنکھوں سے
وہی بس چند آنسو یادگار بزم ماتم ہیں

یہاں کے مشاعروں میں دستور ہے کہ شاعر صاحبان پہلے اپنی اور پھر اپنے اُستاد کی غیر طرح غزلیں پڑھا کرتے ہیں۔ اس کے بعد اپنی طرحی غزل سناتے ہیں مگر اس مشاعرے میں یہ التزام نہیں رہا۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ ہیں

قبل مشاعرہ اس طریقے کی نسبت ناپسندیدگی کا اظہار کر چکا تھا۔ اور بعض احباب سے کہہ دیا تھا۔ کہ میں بارہ بجے سے زیادہ نہ بیٹھونگا۔ غنیمت ہے کہ حضرات احمدآباد نے اس پہ توجہ کی۔ اور کسی شاعر نے طرحی غزل سے پہلے غیر طرح کلام پڑھنے میں وقت نہیں لیا ÷

مشاعرہ اچھے اہتمام و رونق سے ہوا۔ پچیس تیس شاعروں نے غزلیں پڑھیں آخر میں مجھ سے غزل پڑھوائی گئی۔ پہلی غزل کا مقطع کئی بار پڑھوایا گیا۔ میں نے بھی پڑھ دیا۔ مگر اور کوئی شعر باوجود خواہش احباب مکرر نہیں پڑھا۔ ناسازئ طبع کا عذر کر دیا۔ جو سچا تھا۔ بعد ختم مشاعرہ جملہ حاضرین کو چاء پلائی گئی۔ ہم ایک بجے قیام گاہ پہ واپس آئے ÷

مشاعرہ کے نوٹس میں کسی صاحب کا نام نہیں تھا۔ مگر مکان مشاعرہ میں جاکر معلوم ہوا۔ کہ حضرت سہیل سورتی مہتمم و منتظم ہیں ÷

احمدآباد سے تین چار میل کے فاصلے پہ حضرت شاہ عالم و پیر کمال صاحب کے مزارات کی زیارت سے مشرف ہوا۔ اسی روز یہاں کا مشہور کنکریا تالاب اور حوض قطب معاینہ کیا۔ یہ احمدآباد کی سرزمین میں قابل دید چیزیں ہیں شہر سے میل ڈیڑھ میل باہر ایک پرانی مسجد دیکھی۔ اس میں یہ خصوصیت ہے۔ کہ اس کے مینار ہلائے سے ہلتے ہیں۔ منشی غلام حیدر صاحب گھڑی ساز نے اوپر چڑھ کر ایک مینار کو ہلایا۔ تو ہمیں اچھی طرح سے اس کی حرکت محسوس ہوئی۔ طرّہ یہ تھا۔ کہ مقابل میں دوسرا مینار بھی اسی طرح ہل رہا تھا۔ یہ مسجد بہت عالیشان و وسیع ہے۔ مگر اب اس میں شاید نماز کم پڑھی جاتی ہے۔ کیونکہ صفائی اچھی نہ تھی۔ احمدآباد پرانا اور غدار شہر ہے۔ مکانات عموماً کھپریل کے ہیں

مگر کئی کئی منزل اونچے یہاں کسی مکان پر کھلی چھت نہیں دیکھی۔ چارپائی کا
رواج بھی کم ہے۔ جب کسی کی دعوت ہوتی ہے۔ تو پہلے اُسے میٹھی چیز کھلائی
جاتی ہے۔ اس کے بعد اور کھانے۔ یہاں یہ نئی بات دیکھی۔ کہ چیز دینے
والا لینے والے کو سلام کرتا ہے۔ لوگ زبان سے کچھ نہیں کہتے۔ چیز دیکر
اپنی پیشانی تک ہاتھ لے جاتے ہیں۔ یہ طریقہ اگرچہ ہمارے رسم و رواج
کے خلاف ہے۔ مگر بُرا نہیں۔ چیز دینے والا گویا اس بات کا شکریہ ادا
کرتا ہے کہ لینے والے نے اُس کا ہدیہ قبول کیا +

یہاں مختلف قسم کے غالباً ۱۰۰ کارخانے ہونگے۔ وہ دلکش اور چمنیاں
ریل میں دور سے دکھائی دیتی ہیں۔ کاروبار گجراتی زبان میں ہوتا ہے
یہاں تک کہ بعض اُردو شعراء بھی گجراتی حروف میں غزل لکھتے ہیں۔
چاء کافی کا رواج بہت زیادہ ہے۔ ہوٹل بھی بکثرت ہیں +

حضرت پیر محمد شاہ صاحب مدظلہ احمد آباد میں بڑے پایہ کے
بزرگ ہیں۔ امیرانہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ مجھے آپ کے ہاں
محفل میلاد و دعوت میں شریک ہونیکا فخر حاصل ہوا +

جناب عبد علی صاحب قنبر احمد آبادی کے دولت خانے پر جاکر ملاقات
کی۔ اُنہوں نے دیر تک اپنے کلام سے محظوظ فرمایا۔ افسوس ہے۔ کہ
اس زمانہ میں اُنہیں ٹانگ کے درد کی تکلیف تھی۔ جو چوٹ لگ جانے
سے پیدا ہوئی تھی۔ خدا کرے۔ اب اچھے ہوں +

میں سب سے پہلے حضرت سہیل سورتی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کہ
اُنہوں نے مجھ سے خوش خلقی کا برتاؤ کیا۔ اور ہرچند ملاقات مختصر تھی لیکن بہتر کا ثبوت

دیا جتنا چھوٹا۔ اُتنا کھوٹا یہ مثل سہیل صاحب ہی کے برتاؤ سے غلط ثابت ہوئی۔ منشی غلام حیدر صاحب صفدر گھڑی ساز بھی میرے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ یہ ہر موقع و محل پر میرے ہمراہ رہے۔ مہماں نوازی کے علاوہ انہوں نے ایک دن میری گھڑی بھی بلا اُجرت درست کر دی تھی۔ منشی حسن جان صاحب بیتاب سندیلوی بھی اپنا کاروبار چھوڑ کر ہر وقت میرے پاس موجود رہے۔ میں ان کی مہربانی کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ بشیر علی بھائی صاحب شاہد۔ منشی عبدالحکیم نثار۔ سید احمد علی صاحب اسعد مہماں نواز آدمی ہیں۔ منشی نور محمد صاحب ضیا اور حبیب احمد صاحب گلفروش کو دیکھ کر بھی دل روشن ہوا اور طبیعت کھل گئی۔ خدا میرے ان جملہ جدید احباب کو ہمیشہ شاد کام رکھے۔ منشی عبدالکریم جوشش سے بمبئی میں پھر ملاقات ہوگی اسلئے یہاں اُنہیں یہیں چھوڑ دیا +

آخر میں شیخ محمد عثمان صاحب شاد پونوی کا شکرگزار ہوں کہ اُنہوں نے اوّل سے آخر تک مجھے ناشاد نہیں ہونے دیا۔ ان کے خلق حسن نے ضرورت سے زیادہ احمد آباد میں رکھا +

میری مہمانی شاد صاحب کو بہت گراں پڑی ہوگی۔ کیونکہ میرے پاس جو احباب آتے تھے۔ چاء۔ برف۔ شربت اور پان سے سب کی تواضع کی جاتی تھی۔ بلکہ اکثر احباب کھانے میں بھی شامل ہوتے تھے۔ اس لئے شاد صاحب کو بہت صرفہ برداشت کرنا پڑا ہوگا۔ میں احمد آباد میں چار بجے شب سے پہلے کبھی نہیں سویا۔ احباب اپنا کام چھوڑ کر اس وقت تک میرے پاس بیٹھے رہتے تھے۔ میں رات کی کسر دن کو سو کر پوری کیا کرتا تھا +

سیٹھ ابوبکر صاحب رئیس احمد آباد نے اپنی گاڑی میں لیجا کر مجھے مختلف مقامات کی سیر کرائی۔ اس لیئے میں چلتے پھرتے ان کو اکثر یاد رکھتا ہوں۔ جودھپور سے احمد آباد کا کرایہ ۵؍ ۲ہے

بھڑوچ

میں احمد آباد سے ۷ ؍ مئی کو دن کے دو بجے روانہ ہوا۔ یہاں سے ریل کی لاین بمبئی تک بڑی ہے یعنی دہلی سے احمد آباد تک چھوٹی لین آتی ہے۔ اور احمد آباد سے بمبئی تک بڑی۔ شام کے سات بجے بھڑوچ پہنچ گیا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہاں سرائے نہیں۔ آخر بھڑوچ کے مشہور ایڈورڈ ہوٹل میں قیام کیا۔ صبح کو منشی محمد عبدالقادر صاحب اعجاز بھڑوچی کے مکان پر ملنے گیا۔ یہ بہت خوش ہوکر ملے۔ اور مجھے اپنے ساتھ لیجا کر منشی محمد ولد آدم بھائی متخلص بہ وحشی سے ملایا۔ یہ ہوٹل سے میرا اسباب اپنے گھر اُٹھا لائے

میں بھڑوچ میں صرف اعجاز صاحب کی ملاقات کے لئے اُترا تھا۔ نہایت خلیق و باوضع آدمی ہیں۔ مہمان نوازی کی یہ کیفیت ہے۔ کہ مہمان کو اپنی جان تک بیچ کر کھلا دینگے۔ واقعی ان کے دل سے ان کی ہمت بڑی ہے۔ قطع نظر اس سے اعجاز صاحب اساتذۂ دہلی کے سچے قدرشناس اور زبان دہلی کے پکے معتقد ہیں۔ نواح گجرات میں اُستاد سمجھے جاتے ہیں۔ فی الجملہ ایک باخبر شاعر ہیں۔ مگر اپنی معلومات سے فائدہ اٹھانے کی پروا نہیں کرتے

میر عباس علی صاحب فضا۔ پیرزادہ سید محمود میاں صاحب حمید منشی عبدالرحیم صاحب انس بھڑوچی سے بھی ملاقات ہوئی۔ جملہ حضرات نے خوش خلقی کا اچھا ثبوت دیا +

۱۹۔ مئی کو رات کے تین بجے منشی محمد عبدالقادر صاحب اعجاز کے آدمی نے مجھے آکر اٹھایا۔ اور کہا کہ آپ کو اعجاز صاحب بلاتے ہیں ۔ میں نے گھڑی دیکھی تو تین بج چکے تھے۔ اس ناوقت طلبی کا سبب سمجھ میں نہ آیا۔ آخر یہ سوچ کر کہ اس وقت بلانے کی کوئی علت ضرور ہے میں فوراً کپڑے پہن کر تیار ہو گیا۔ وحشی صاحب بھی ہمراہ چلے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اعجاز صاحب کے خاندان میں کسی شادی کی تقریب پر رنڈی کا ناچ تھا اس محفل رقص میں شریک کرنے کے لئے میں بلایا گیا تھا۔ اگر مجھے پہلے یہ کیفیت معلوم ہو جاتی۔ تو شاید نہ جاتا۔ مگر جب گیا۔ تو محفل میں کچھ دیر بیٹھنا پڑا۔ سورت کی مشہور رنڈی عیدن گا رہی تھی +

یکم جمادی الاوّل مطابق ۲۱۔ مئی کو راندیر متصل سورت ایک عرس کی تقریب پر مشاعرہ تھا۔ اعجاز صاحب و دیگر شعرائے بھڑوچ نے مجھ سے کہا کہ ہم سب اس مشاعرے میں شریک ہونگے۔ تم بھی غزل لکھو ہم بھی لکھیں گے۔ اور اکٹھے راندیر چل کر پڑھیں گے۔ چنانچہ غزلیں لکھی گئیں۔ مگر اہل بھڑوچ کو ۳۰ کے چاند کا دھوکا رہا۔ ان کے حساب سے یکم جمادی الاوّل ۲۲۔ مئی کو ہوئی۔ پھر تحقیق کرنے سے معلوم ہوا۔ کہ چاند دراصل ۲۰۔ مئی کو ہو چکا ہے۔ اور ۲۱۔ مئی کو جمادی الاوّل کی پہلی تاریخ تھی۔ جب وقت گزر گیا۔ تو شعرائے بھڑوچ نے اپنا ارادہ فسخ کر دیا۔ میں نے جو غزل لکھی تھی۔ وہ حسب ذیل ہے :-

مصرع یہ تھا۔ رہتی ہے رات دن تری تصویر ہاتھ میں ۔

دشمن نے لی وہ زلف گرہ گیر ہاتھ میں
اچھا ہوا کہ پڑ گئی زنجیر[۱] ہاتھ میں

لی اس نے میرے قتل کو شمشیر ہاتھ میں
قبضہ نہیں یہ ہے مری تقدیر ہاتھ میں

رکھتا ہوں روئے یار کی تصویر ہاتھ میں
قرآں مری بغل میں ہے تفسیر ہاتھ میں

مژگاں کو چھیڑنے کی یہ اچھی سزا ملی
مارا ہے اس نے ناک کے اک تیر ہاتھ میں

قدرت خدا کی ہے ید بیضا کلیم کا
آخر کہاں سے آ گئی تنویر ہاتھ میں

وہ سخت جاں ہوں میں کہ مرے امتحاں کے لئے
بھولے سے بھی وہ لینگے نہ شمشیر ہاتھ میں

دشمن کا خط ہے ہم سے چھپاتے ہو تم عبث
خود منہ سے بول اٹھی ہے تحریر ہاتھ میں

وہ فتنہ گر جواں ہے مدعا اس سے مانگ اب
لے یہ عصا تو اے فلک پیر ہاتھ میں

صیاد کی نظر سے مرا دل تڑپ سکا
لٹکا لیا ہے مار کے نخچیر ہاتھ میں

عاشق کا مال مار کے اترا رہے ہیں وہ
مٹھی میں دل ہے یا کوئی جاگیر ہاتھ میں

ہوتی ہے دور دست تسلی سے بیکلی
رکھتے ہیں خوبرو بھی یہ تاثیر ہاتھ میں

محشر میں چل بھی کر نہیں سکتا کوئی دغا
ہے نامۂ عمل کی وہ تحریر ہاتھ میں

اللہ رے شوق ظلم یہ جدت تو دیکھئے
رکھتے ہیں وہ چھڑی کے عوض تیر ہاتھ میں

مختار ہو کے پھر بھی ہے مجبور آدمی
تدبیر سے نہ آئے گی تقدیر ہاتھ میں

دیکھا کہیں جہاں میں نہ اس شکل کا حسین
ہم لے کے پھر گئے تری تصویر ہاتھ میں

کافی ہے بس مجھے تو وجاہت کا آسرا
محشر کے دن ہو دامن شبیر ہاتھ میں

بھڑوچ بہت بڑا شہر نہیں۔ مردم شماری نصف لاکھ کے لگ بھگ ہوگی اس کی آبادی نہایت خوشنما و دلکش ہے۔ کچھ مکان بلندی پر بنے ہیں

[۱] اگرچہ زنجیر پاؤں میں اچھی معلوم ہوتی ہے مگر یہاں ہاتھ میں زنجیر پڑنے کا ثبوت بھی لطف سے خالی نہیں ۔

اور کچھ پستی میں۔ اس لئے دور سے بڑا شہر معلوم ہوتا ہے۔ دریائے نربدا شہر کی دیوار سے ملا ہوا بہتا ہے۔ اس میں کشتیاں چلتی ہیں۔ اس دریا کا پل جس کے اوپر سے ریل گزرتی ہے۔ قابل دید ہے۔ یہاں کا پانی عموماً تلخ اور کھاری ہے۔ ایسا کہ اگر کوئی شخص بھولے سے کلی کرے تو کونین کا مزہ آجائے۔ پینے کے لئے بعض مقامات کا پانی مخصوص ہے۔ یہاں بکثر قصاب زیادہ رہتے ہیں۔ جو عموماً خوشحال ہیں۔ اردو اور گجراتی دونوں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اعجاز صاحب کے دم سے شعر و شاعری کا اچھا چرچا رہتا ہے۔ احمد آباد سے بھڑوچ کا کرایہ ۱۲؍ ہے۔ شہر اسٹیشن سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلہ پر ہے ؎

سورت

میں ۱۳ مئی کو بھڑوچ سے چار بجے کے قریب سورت کی طرف روانہ ہوا۔ حسنی اور اعجاز صاحب اسٹیشن تک رخصت کرنے آئے اور گاڑی چلے جانے کے بعد واپس گئے۔ ریل ۷ بجکر کچھ منٹ پر سورت پہنچ گئی۔ میں نے یہاں صرف یہ کام کیا۔ کہ اسٹیشن سے گاڑی کرایہ کرکے سید رضا بخشی نجمی صاحب متخلص شیدا کے مکان پر گیا۔ اور وہاں جاکر مولوی نجم الدین صاحب ثاقب بدایونی کو دریافت کیا۔ میرا خیال تھا کہ مولوی صاحب راندیر کے عرس میں شریک ہونے کے لئے بڑودہ سے ضرور تشریف لائے ہونگے۔ مگر دریافت کرنے سے سخت مایوسی ہوئی۔ شیدا صاحب کے مکان پر میں نے اپنا نام پتا کچھ نہیں بتایا۔

اُسی وقت واپس ہوا۔ اس اثناء میں وہ تین بازاروں کی سیر ہوگئی۔ سورت نہایت پُر رونق و آباد شہر ہے۔ بازار بھی کشادہ ہیں۔ ریلوے اسٹیشن اگرچہ مختصر ہے۔ مگر کرسی دیکھ بنایا گیا ہے۔ مسافر سیڑھیاں چڑھ کر پلیٹ فارم پر پہنچتے ہیں۔ پھر ریل میں بیٹھتے ہیں۔ کاروبار گجراتی میں ہوتا ہے۔ اُردو بھی بولی جاتی ہے۔ بھڑوچ سے سورت کا کرایہ ۱۰؍ ہے ✚

بمبئی

۲۳ مئی کو ۹ بجے شب کے بعد سورت سے سوار ہوا۔ اور پانچ بجے سے پہلے اسٹیشن گرانٹ روڈ بمبئی پر پہنچ گیا۔ یہاں سے بھنڈی بازار تک گاڑی کرایہ کی اور ایک مسجد میں اسباب رکھ کر صبح کی نماز پڑھی۔ جب کچھ دن چڑھا۔ تو میں اپنا اسباب ایک شخص کے سپرد کر کے جو غالباً مؤذن تھا۔ بازار کو روانہ ہوا۔ سب سے پہلے قاضی عبدالکریم صاحب کی دکان پوچھی کیونکہ یہاں مجھے حاجی تجمل حسین صاحب تجمل جلالپوری سے ملنا تھا۔ مگر دکان بند تھی۔ معلوم ہوا کہ ۹ بجے کھلتی ہے۔ پھر میں نے زکریا مسجد کی راہ پوچھی۔ اور مولوی محمد انور صاحب انور مدرس مدرسۂ ہاشمیہ سے ملاقات کی انہوں نے ۹ بجے کے بعد ایک لڑکا میرے ساتھ کیا۔ کہ مجھے حاجی تجمل حسین صاحب سے ملا دے۔ اس مرتبہ دکان تو کھلی پائی۔ مگر حاجی صاحب موجود نہ تھے۔ کتب خانہ کے ایک محرر نے مجھ سے کہا۔ کہ آپ بیٹھ جائیے۔ حاجی صاحب آیا ہی چاہتے ہیں۔ چند منٹ کے بعد حاجی صاحب تشریف لا کر دکان کے اندر میرے پاس ہی بیٹھ گئے۔ مگر مجھے اُسوقت

تک علم نہ ہوا کہ دوسرے شخص نے انہیں نام لے کر پکارا۔ پھر میں نے
پوچھا کہ حضرات آپ صاحبان میں حاجی تجمل حسین صاحب کون بزرگ ہیں
حاجی صاحب فوراً بول اُٹھے۔ فرمایئے کیا ارشاد ہے۔ اس کے جواب
میں میں نے اپنا نام پتہ بتایا۔ حاجی صاحب بہت تپاک سے ملے۔
اور کہنے لگے کہ کئی روز سے آپ کا انتظار ہو رہا تھا۔ آپ فوراً اُٹھے
اور میرے ساتھ اُس مسجد میں گئے۔ جہاں میرا اسباب رکھا تھا۔ وہاں سے
ٹرنک وغیرہ اٹھوا کر مجھے پنچ بہادر بمبئی کے دفتر میں ٹھہرایا۔ یہ موقع گرانٹ
پرووٹا نکی کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں پنچ بہادر اور سلطان الاخبار کے
معاوضے میں بہت سے اُردو۔ انگریزی اخبار آتے تھے۔ اس لئے یہاں
قیام کرنے میں مجھے زیادہ دلچسپی رہی۔ میں آج شام تک اخبار دیکھتا رہا
بعض احباب کو خطوط لکھے۔ تمام دن پنچ بہادر کے دفتر میں گزر گیا۔ رات کو
میر کاظم حسین صاحب ہدف لکھنوی اڈیٹر رسالہ غنچہ جاوید بمبئی اور
مولوی عبید اللہ احمد صاحب مترجم گورنمنٹ سکریٹریٹ سے ملاقات ہوئی
۲۵ مئی کو میں نے سب سے پہلے جو کام کیا۔ وہ یہ تھا۔ کہ حوائج ضروریہ سے
فارغ ہو کر منشی ونایک شاہ صاحب طالب بنارسی کی تلاش میں نکلا
انہوں نے اپنے مکان کا پتہ بھی لکھا تھا۔ اور بالی والا تھیٹریکل کمپنی کا بھی
مکان میری جائے قیام سے کچھ فاصلہ پر تھا۔ البتہ تھیٹر قریب تھا اسلئے
میں ٹریموے میں بیٹھ کر جلد پہنچ گیا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ
آج اتوار ہے طالب صاحب سے ملاقات نہ ہو سکیگی۔ میں یہ سن کر
مکان پر واپس چلا آیا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر سو رہا۔ شام کو پانچ بجے کمپنی

میں اور میر کاظم حسین صاحب ہدف لکھنوی زکریا مسجد میں مولوی محمد انور
صاحب انور کے پاس گئے اور وکٹوریا گاڑی میں سوار ہو کر چوپاٹی پہنچے
یہ آج پہلا موقع ہے کہ میں نے سمندر کا نظارہ کیا۔ اور نظارہ بھی کیسا
نہایت دلکش و عجیب۔ چوپاٹی واہ ری چوپاٹی تیرے کیا کہنے تیرا جلوہ
دل کو سرور آنکھوں کو نور بخشتا ہے۔ راجہ اندر کا اکھاڑا اور قاف کا پرستان
بھی ہوگا۔ تو ایسا ہی ہوگا۔ چوپاٹی کو اندھا بھی دیکھے تو آنکھیں سی کھل جائیں
عجیب پُر فضا مقام ہے ◆

چوپاٹی سمندر کے کنارے ایک وسیع میدان ہے۔ پانی کے کنارے
پتھر کی ایک لمبی سڑک بنی ہے۔ اس پر آدمیوں کے بیٹھنے کے لئے
جا بجا بنچیں پڑی ہیں۔ شام کو سورج کی گرمی کم ہوتے ہی سیکڑوں
گاڑیوں۔ بائیسکلوں کی آمد و رفت شروع ہو جاتی ہے بعض کفایت شعار
خوش مزاج پیدل آتے ہیں۔ اور چوپاٹی کی سڑک گلزار بن جاتی ہے۔
سیکڑوں پری اندام لیڈیاں رنگا رنگ کی ساڑیاں اور سارے زیب تن
کئے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر گشت کناں دکھائی دیتی ہیں۔ پان
چاء۔ کافی بیچنے والے بھی موجود رہتے ہیں سمندر کی لہروں کا شور گاڑیوں
کی گھڑگھڑاہٹ لباس کی گوناگونی حسینوں کی چہل قدمی عجیب دلفریب منظر
پیدا کرتی ہے۔ یہ نظارہ دہلی و لاہور میں آنکھوں کو میسر نہیں ہو سکتا۔ مگر
میری طبیعت کچھ عجیب قسم کی واقع ہوئی ہے۔ میں اس تماشے سے منہ پھیر کر
سمندر کی ریت میں جا بیٹھا۔ ہدف و انور نے بھی میرا ساتھ دیا۔ اچھی
صورتوں کے دیکھنے میں یہ برائی تھی کہ نظر کسی حسین چہرے پہ صرف بالشت بھر

جگہ میں گردش کر سکتی تھی - پورا لطف نظارہ نہ اُٹھنے پاتا تھا۔ کہ دوسری شکل سامنے آجاتی تھی - اس پریشاں نظری سے مردم دیدہ کے آوارہ ہو جانے اور حضرتِ دل کے تکلیف اُٹھانے کا اندیشہ تھا - اس لیئے کنارہ ہی مناسب سمجھا گیا - یہاں جدِ نظر تک ایک ہی جلوہ سیراب کرنے کے لیئے کافی تھا بمبئی کی چوپاٹی نہ سہی حسین شکلیں لاہور میں بھی نظر گذر جاتی ہیں - مگر سمندر نہیں مل سکتا - اس لیئے میں نے سمندر کے نظارے کو ترجیح دی۔ دن غروب ہونے کے قریب سمندر کے کنارے سے دو ڈھائی میل کے فاصلے پر پانی میں ایک مینار کی چوٹی روشن ہوئی یہ در اصل ایک لالٹین ہے - جو بمبئی آنے والے جہازوں کی رہنمائی کرتی ہے - اس کی روشنی چاروں طرف پھرتی رہتی ہے - کبھی شمال کی طرف کبھی جنوب کی جانب علیٰ ہذا القیاس - مجھے یہ تماشا نظر آیا اسلیئے دیر تک اسی کو دیکھتا رہا - یہیں منشی افتخار علی صاحب جگر شاگرد حضرت امیر مینائی سے ملاقات ہوئی - اندھیرا ہو جانے پر ہم اپنے گھروں کو واپس چلے آئے ۔

۲۶ - مئی کو چار بجے شام سے پہلے میں اور میر کاظم حسین صاحب ہدف بالی والا تھیٹر میں منشی طالب بنارسی سے ملنے گئے - آپ اس وقت موجود تھے - ہدف صاحب نے میرا تعارف کیا - طالب صاحب ایک علیحدہ کمرے میں میز کرسی لگائے بیٹھے تھے - میں اُن سے اور وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے - ایک اُستاد کے شاگرد باہم بھائی بھائی ہوتے ہیں - مگر افسوس ہے کہ فی زمانہ لوگ اس کا بہت کم خیال

رکھتے ہیں مگر طالب صاحب مجھ سے اسی طرح ملے جس طرح کوئی اپنے
بھائی سے ملتا ہے۔ آپ کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہے۔ نہایت
بے تعصب اور خلیق آدمی ہیں۔ آپ نے کیک، لیمونیڈ، پان سے تواضع
کی۔ آدھ گھنٹہ کے بعد ہم نے اجازت چاہی۔ بھنڈی بازار سے طالب
صاحب بھی رخصت ہو گئے۔ میں سیدھا زکریا مسجد پہنچا۔ وہاں سے
میں اور مولانا انور مع منشی عبدالکریم جوش ایک بندرگاہ کو روانہ ہوئے
یہاں سے جہاز وغیرہ روانہ نہیں ہوتے۔ چھوٹے چھوٹے اگبوٹ اور
کشتیاں چلتی ہیں۔ شاید ہمارے پیسے دیکھے۔ ہم ہر سہ اشخاص ایک کشتی
میں سوار ہوئے۔ اور تقریباً ایک میل تک سمندر میں گئے۔ مولانا انور
نے مجھ سے کہا۔ کچھ سنائیے۔ اثنائے سفر میں غزل وغیرہ کہنے کا مجھے اکثر
اتفاق ہو چکا تھا۔ اس لئے میں نے چند غزلوں کے چند اشعار جو اس وقت
یاد آتے گئے مولوی صاحب کو سنائے۔ انہوں نے بھی اپنے کلام سے
محظوظ کیا۔ یہ تھوڑی دیر کی بحری سیر نہایت پُرلطف رہی۔ شام کو مولوی
انور صاحب کے ہاں میری دعوت تھی۔ اس لئے میں آج رات انہیں
کے پاس مقیم رہا۔ ۲۷ مئی کی صبح کو شیخ بہادر کے دفتر میں چلا آیا۔ بعض
خطوط کے جواب لکھے۔ شام کو حاجی تجمل حسین و مولانا انور تشریف لائے
اور تفریح طبع کے لئے ایک ہوٹل میں جا کر بیٹھ گئے۔ یہیں مغرب کی
نماز پڑھتے ہوئے حاجی صاحب کا جوتا چوری گیا۔

۲۸ مئی جمعہ کا دن حاجی تجمل حسین اور مولوی محمد انور صاحب کی چھٹی کا
تھا۔ آج سے لئے یہ بات قرار پا چکی تھی کہ جس بندرگاہ سے جہاز روانہ

ہوتے ہیں۔ وہاں کی سیر کی جائے۔ چنانچہ تین بجے کے قریب ہیں اور
حاجی تجمل حسین صاحب زکریا مسجد سے مولوی انور کو ساتھ لے کر بسواری
ٹریم بندرگاہ مذکور پر پہنچے۔ یہاں تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے کئی جہاز
ایستادہ تھے۔ حسن اتفاق سے تھوڑی دیر کے بعد ایک مال کا جہاز چین
وغیرہ کی طرف روانہ ہونے والا تھا۔ ہم اس کی روانگی کا نظارہ دیکھنے گئے
ایک بنچ پر جو انگریز افسر جہاز کے کمرے سے باہر پڑی تھی بے تکلف بیٹھ
گئے۔ بعض ملازمان جہاز نے ہم سے کہا کہ صاحب کا مزاج بہت سخت ہے
عجب نہیں وہ آپ کو یہاں دیکھ کر برہم ہو۔ مگر ہم نے کچھ پروا نہ کی۔ چند
منٹ کے بعد صاحب بہادر دروازہ پر تشریف لائے اور ہم سے
پوچھا۔ آپ لوگ یہاں کیسے؟ مولانا انور دروازہ کے قریب تھے انہوں
نے جواب دیا کہ سیر دیکھنے آئے ہیں۔ صاحب بہادر نے جو طبعاً شریف
تھے بخندہ پیشانی کہا۔ آپ اندر آجائیے۔ ہم سب نے صاحب کی اس
مہربانی کا شکریہ ادا کیا۔ اور اطمینان سے اسی جگہ بیٹھے رہے۔ تقریباً پاؤ
گھنٹہ کے بعد ایک جہاز کو حرکت ہوئی۔ اور وہ بہت دھیمی رفتار سے
چل کر ہمارے پاس ہی آٹھہرا۔ خلاصی موٹے موٹے رسے جہاز سے
کنارے پر پھینکنے لگے۔ دوسرے خلاصیوں نے ان رسوں کو کھونٹوں سے
باندھ دیا۔ جہاز کی گزرگاہ میں پل حائل تھا۔ ہم حیران تھے کہ جہاز کا رستہ
تو ہے نہیں یہ آگے کیونکر جائیگا۔ مگر جب پل کے نیچے پانی کا اتار چڑھاؤ
جہاز گزرنے کے قابل ہوگیا۔ تو جہاز کو پھر حرکت ہوئی۔ کنارے والے
خلاصیوں نے بتدریج رسے ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ جس وقت جہاز پل

کے بالکل قریب آیا تو پل کا ایک سرا اُٹھا اور چکّر کھا کر دوسرے کنارے
سے جا ملا۔ اس طرح جگہ خالی ہو گئی۔ جہاز آہستہ آہستہ یہاں سے
نکل کر گہرے پانی میں آیا اور چند منٹ کے بعد تیز رفتاری سے بڑھنے
لگا۔ حتیٰ کہ نظروں سے غائب ہو گیا۔ پل پھر برابر ہو گیا۔ اور اس پر سے
گاڑیاں گھوڑے پیدل سوار اِدھر اُدھر گزرنے لگے۔ شاید ناظرین کو
تعجب ہو گا۔ کہ سمندر میں پل کیسا اور لوگ اس سے عبور کر کے کہاں جاتے
تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ جگہ کنارے کے قریب ہے جس طرح بڑے
کمرے میں کوٹھریاں ہوتی ہیں۔ اسی طرح سمندر میں جہازوں کی حفاظت
کے لئے بعض ٹکڑے علیحدہ کر لئے گئے ہیں۔ ان کے اردگرد خشکی اور
ایک طرف پانی ہے۔ اس پانی پر پل باندھ دیا ہے۔ تاکہ آمد و رفت میں
دقّت نہ ہو۔ ایسے پل اور ایسے قطعے سمندر میں بہت جگہ ہیں۔ اس سے
بھی زیادہ حیرت انگیز وہ منظر ہے جہاں جہاز کے زیریں حصّہ کی مرمت
اور رنگ وغیرہ کیا جاتا ہے۔ جب کسی جہاز پر رنگ کرنے کی ضرورت محسوس
ہوتی ہے۔ تو مشین کے ذریعہ سے اس گودی کا پانی نکال کر جگہ بالکل
خشک کر دی جاتی ہے۔ اتفاق حسنہ سے آجکل اس گودی کا پانی نکلا
ہُوا تھا۔ اور جہازوں کی مرمت ہو رہی تھی۔ اس لئے ہمیں اس کی سیر کا
بھی موقع مل گیا۔ یہ بہت گہری جگہ ہے۔ ایسی کہ اس کی زمین دیکھنے سے
خوف معلوم ہوتا ہے۔ اندر پکّا فرش ہے۔ اس پر تپائیاں رکھی ہیں
جہاز ان کے اوپر ٹھہرا دیا جاتا ہے مرمّت کے بعد اس جگہ پانی بھر
دیتے ہیں جس سے جہاز تیر کر چلنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ ہم نے

سیڑھی کے ذریعہ سے چڑھ کر کئی جہازوں کی سیر کی۔ تجارتی مال بھی بار ہوتے دیکھا۔ مال گودام سے دس دس پندرہ پندرہ بوریاں ایک جگہ جمع کر کے مضبوط آہنی زنجیروں سے جکڑ دی جاتی ہیں۔ اس کے بعد جر ثقیل کا عمل شروع ہوتا ہے۔ وہ بوریاں اوپر اٹھ کر جہاز میں ٹھیک اسی جگہ پہنچ جاتی ہیں۔ جہاں رکھنی منظور ہوتی ہیں۔ ہاتھی اونٹ بھی اسی طرح لٹکا کر جہاز میں رکھ دیئے جاتے ہیں۔ ہم نے کئی جہاز اندر سے دیکھے۔ جن میں عربیہ اور مظفری بھی تھے۔ آج بندرگاہ میں زیادہ وقت صرف ہوا۔ شام کو میں اور حاجی تجمل حسین صاحب مولانا انور کے ہاں مدعو تھے۔ اس لئے ہم سیدھے زکریا مسجد پہنچے حاجی صاحب کھانا کھا کر چل دیئے میں آج بھی یہیں رہا۔

۲۹ مئی سنیچر کے دن منشی وناپک پرشاد صاحب طالب بنارسی سے پھر ملاقات ہوئی۔ اسوقت ان کے پاس سید ظفر حسن صاحب خاطر لکھنوی بھی تھے۔ کچھ دیر شعر و شاعری کا خوب چرچا رہا۔ آج شب کو طالب صاحب نے تھیٹر کا تماشا دیکھنے کی دعوت دی۔ اور دو آدمیوں کے لئے اوّل درجے کا پاس ایک لفافے میں بند کر کے بڑے تکلف سے میرے سامنے پیش کیا۔ میں نے پاس دیکھ کر اُن کا شکریہ ادا کیا چلتے وقت اُنہوں نے اس امر کی خاص تاکید کی۔ کہ آپ کے ساتھ جو صاحب آئیں۔ اُنکا لباس بھی بہت صاف اور اُجلا ہونا چاہئے کیونکہ تھیٹر میں معزز لیڈیاں بکثرت آتی ہیں۔ اس لئے کپڑے صاف ہونے چاہئیں۔ میں نے کہا بہت اچھا۔

مکان پر واپس جانے کے کچھ دیر بعد حاجی تجمل حسین صاحب تشریف لے آئے۔ اور مجھ سے کہا۔ کہ آج ہمارے پڑوس میں آپ کی دعوت ہے میں نے کہا۔ بہت خوب۔ مغرب کے وقت وہ مجھے اپنے ہمراہ لے گئے کھانے سے فراغت پا کر تھیٹر میں چلنے کی فکر ہوئی۔ کیونکہ ۹ بجے پہنچنا تھا میں مکان پر واپس چلا آیا۔ آدھ گھنٹے کے بعد حاجی صاحب بھی میرے پاس آ گئے۔ اور ہم دونوں تھیٹر کی طرف روانہ ہو گئے +

گیٹ کیپر سے معلوم ہوا کہ طالب صاحب ناسازیٔ طبع کی وجہ سے نہ آ سکیں گے۔ اس نے ہمیں اندر لیجا کر اوّل نشست کی کرسیوں پر بٹھا دیا۔ چند منٹ کے بعد تھیٹر ہال میں دفعتًہ برقی روشنی ہوئی۔ تمام منظر والقعہ نور بن گیا۔ ساتھ ہی برقی پنکھے بھی چلنے لگے۔ ساڑھے نو بجے تک سب درجے آدمیوں سے بھر گئے۔ بقول طالب صاحب یورپین اور پارسی لیڈیاں بکثرت شریک ہوئیں۔ میرے اور حاجی تجمل حسین صاحب کے دہنے بائیں آگے پیچھے۔ غرض ہر طرف زنانہ حسن کا سب تھا۔ ٹھیک ساڑھے نو بجے گھنٹی بجی اور ڈراپ سین اُٹھ کر تماشا شروع ہو گیا۔ آج کوئی اچھا کھیل نہ تھا۔ زنجیر گوہر کا مصنف اُردو زبان سے نا آشنا اور اصول ڈرامہ نویسی سے ناواقف ثابت ہوا۔ اس تماشے میں ہمیں ایک نقل زیادہ پسند آئی۔ وہ یہ کہ دوران تماشہ میں ایک صاحب لکھنؤ کے بوڑھے نواب بن کر آئے۔ ان کو نئی شادی کا چاؤ تھا۔ ان کے ہمراہ حقہ بردار۔ پاندان بردار اور کئی دیگر خدمتگار تھے۔ نواب صاحب قریب قریب زنانہ لباس میں اسٹیج پر نمودار ہوئے

ان کی محبوبہ سامنے آئی۔ تو انہوں نے ایک مصرع پڑھ کر دوسرا مصرع موزوں کئے جانے کی درخواست کی۔ وہاں کیا دیر تھی۔ اُس پری جمال نے جو جبر سے تعلیم یافتہ و شاعرہ بھی تھی فوراً مصرع موزوں کر دیا۔ نواب صاحب اور ان کے ساتھیوں نے جس طریق سے اس جودتِ طبع کی داد دی اُس کا پورا نقشہ الفاظ میں نہیں کھینچ سکتا۔ واقعی یہ معلوم ہوتا تھا۔ گویا ہم اس وقت لکھنؤ کی کسی صحبت میں موجود ہیں۔ میں اور حاجی صاحب دیر تک ہنستے رہے۔ اس تماشے کے بعض سین نہایت دلچسپ و حیرت انگیز تھے۔ ہم دو بجے اپنے اپنے گھر چلے آئے۔ واضح ہو کہ یہ کھیل طالب صاحب کا بنایا ہوا نہیں ❊

بالی والا تھیٹر ہندوستان اور انگلستان میں خوب شہرت حاصل کر چکا ہے۔ غالباً ۱۹۰۵ء میں جب یہ کمپنی لاہور آئی۔ تو ہم نے اس کے چند کھیل پہلی مرتبہ دیکھے تھے۔ مسٹر خورشید جی بالی والا پروپرائٹر کمپنی مذکور ایک تجربہ کار و جہاں دیدہ جنٹلمین ہیں۔ بعض تماشوں میں خود بھی پارٹ لیتے ہیں۔ اور نہایت عمدگی سے ایکٹ کرتے ہیں۔ میں اس کمپنی کا ذاتی مکان اور ساز و سامان دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ حقیقت میں ہندوستان میں سربرآوردہ کمپنی ہے۔ میں اس کی دن دونی رات چوگنی ترقی کا دل سے خواستگار رہوں ❊

۳۰ مئی اتوار۔ آج شام کو منشی افتخار علی صاحب جگر مالک آفتاب جگر کمپنی شاگرد حضرت امیر مینائی کے مکان پر مشاعرہ سا تھا۔ یا سوجہ سے کہ خاص خاص احباب بلائے گئے تھے۔ مجمع عام نہ تھا۔ دو تین بوڑ

پہلے رسالۂ گلچیں لکھنؤ کی یہ طرح میرے پاس بھیجی گئی ؎

میلا لگا ہے پیرِ مغاں کی دکان پر

میں نے اس پر غزل کہنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ تو بعض احباب نے کہا۔ کہ اس مشاعرہ میں اہل لکھنؤ و شاگردانِ امیر کا زور ہوگا۔ آپ کا غزل لکھنا اور شریک مشاعرہ ہونا مناسب نہیں۔ میں نے جواب دیا۔ کہ میں اہل لکھنؤ کی تہذیب و شائستگی سے واقف ہوں۔ آپ کو جس بات کا اندیشہ ہے۔ مجھے اس کا شک بھی نہیں گزر سکتا۔ خصوصاً اس مشاعرے میں مجھے ضرور شامل ہونا چاہیے۔ کیونکہ باکمالانِ لکھنؤ کی ہم بزمی کا فخر حاصل ہوگا۔ قصہ کوتاہ میں اور حاجی تجمل حسین صاحب وقت معینہ پر مشاعرہ میں پہنچے۔ مندرجہ ذیل شعراء نے طرحی و غیر طرحی غزلیں پڑھیں۔ حاجی تجمل حسین صاحب۔ منشی افتخار علی صاحب جگر۔ میر کاظم حسین صاحب ہدف لکھنوی۔ فدا علی صاحب اسرار لکھنوی۔ شیخ احمد صاحب وداد۔ سید سلطان میاں سلطان۔ عزیز حبیب قیس۔ میں نے چند شعر کی جو غزل لکھی۔ اس کی نقل ملاحظہ ہو:-

کیونکر کھلا یہ رازِ محبت جہان پر ۔۔۔ میری زبان پہ نہ تمہاری زبان پر

سجدے کرینگے تیرے قدم کے نشان پہ ۔۔۔ لے جائیں گے زمین کو ہم آسمان پہ

ابرو پہ آئینے میں نظر کی ہے یار نے ۔۔۔ واللہ خوب تیر چلا ہے کمان پہ

چھوڑا نہ جذبِ دل نے مرے ایک تیر بھی ۔۔۔ ترکش ٹپک پڑا ہے اب اس کی کمان پہ

کچھ تم بھی جانتے ہو مآلِ شبِ وصال ۔۔۔ منہ آتے ہیں رقیب تمہاری زبان پہ

گاہک نہ کیوں ہوں لوگ کہ بازارِ حسن میں ۔۔۔ بیٹھے ہیں بن سنور کے وہ اونچی دکان پہ

دشمن کا پان کھاتے ہی بس لال ہو گئے ۔۔۔ آیا ہے خوب رنگ تمہاری زبان پہ

کیا تفرقہ ہے بعد فنا جسم و روح میں
یہ سہے زمین کے نیچے تو وہ آسمان پر

زاہد چلو کہ شیخ کی پگڑی بکے گی آج
نیلام ہوگا پیر مغاں کی دکان پر

چلتے میں آئے آہ سے میری سب اہل پیچ
اچھی بلا زمین سے گئی آسمان پر

وہ آ کے میری قبر پہ کہتے ہیں ناز سے
اب تم مکان میں ہو تو ہم ہیں مکان پر

وہ اور وعدہ وصل کا قاصد غلط غلط
کچھ حاشیے چڑھائے ہیں تو نے بیان پر

سمجھا ہے لفظ آہ کو اللہ وہ صنم
بد ظن ہوا ہے مجھ سے فقط اس گمان پر

پیش نگاہ رہتا ہے ہر وقت آئینہ
خود شیفتہ ہیں اپنی ہی وہ آن بان پر

بچنے سے کھینچ کے آنکھوں میں دم آ گیا مرا
اس عاشقی میں دل نے بنائی ہے جان پر

کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہیں۔ اللہ کی پناہ
رکھتے نہیں وہ کان مری داستان پر

اہل زبان سے کہہ دو وجاہت کہ ہوشیار
دشمن کے سخت وار ہیں اردو زبان پر

اگر کوئی صاحب دیکھنا چاہیں۔ تو یہ سب غزلیں رسالہ گلچیں میں نظر سے گذر سکتی ہیں۔ ہدیت صاحب نے چند اشعار خوش آوازی سے بھی سنائے۔ آپ فن موسیقی میں خاصا دخل رکھتے ہیں ✤

۳۱ مئی کو حضرت ہدیت مجھے ٹرمیوے میں بٹھا کر وکٹوریا گارڈن لے گئے کہتے ہیں۔ یہاں ہفتہ اور اتوار کو شام کے وقت اچھا جلسہ ہوتا ہے انگریزی باجا سریلی تانیں اڑاتا ہے۔ اور بہت سی لیڈیاں او جنٹلمین جمع ہو کر سیر کا لطف اٹھاتے ہیں۔ افسوس آج یہ بات نہ تھی۔ باغ اچھا ہے۔ مگر زیادہ قابل تعریف نہیں۔ اس میں ایک مختصر سا چڑیا خانہ بھی ہے ✤

بمبئی بلحاظ آبادی و مردم شماری ہندوستان میں چوتھی کا شہر ہے دس گیارہ لاکھ آدمی بستے ہیں۔ اس کا ہر مکان ایک چھوٹی سی بستی یا

گاؤں ہے۔ عموماً کئی کئی منزل کے عالیشان محلات ہیں۔ کرایہ بہت زیادہ ہے
بازار کشادہ اور بارونق ہیں۔ اس خصوص میں دہلی و لاہور اس شہر سے کچھ
نسبت نہیں رکھتے بمبئی کے سامنے یہ دونوں شہر ایسے ہیں۔ جیسے
نئی نویلی دلہن کے روبرو بیوہ +

میں نے اس شہر کا کوئی حصہ غیر آباد یا بے رونق نہیں دیکھا۔
البتہ جو علمی چرچا پنجاب میں ہے۔ وہ یہاں نہیں پایا جاتا۔ دنیا کے ہر ملک کا
آدمی بمبئی میں ملتا ہے۔ تجارتی کاروبار کی وجہ سے اس شہر کی خاص شہرت
ہے۔ اور یہ خوشی کی بات ہے۔ کہ یہاں درماندہ قوم کے لوگ یعنی مسلمان
اچھی حالت میں ہیں۔ مگر اکثر تہذیب و شائستگی سے معرا ہیں۔ مسجدوں
کی طرز بھی نرالی ہے۔ گنبد کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ دروازہ پر ایک
آدھ مینار بنا دیا ہے۔ سب مسجدیں صاف شفاف۔ فرش فروش اور
جھاڑ فانوس وغیرہ سے آراستہ و پیراستہ اور اکثر دو منزلہ ہیں۔ ہوٹل بھی
بکثرت ہیں۔ جو رات کے دو بجے تک برابر کھلے رہتے ہیں۔ چاء، کافی
اور چاول کا استعمال زیادہ ہے۔ شب و روز عجیب چہل پہل رہتی ہے
بڑے بازاروں میں ٹریم چلتی ہے۔ چار پیسے دیکر سوار ہو جائیے
اور گاڑی کے آخری مقام تک سیر کرتے جائیے۔ یہاں یکے یا ٹم ٹم کا نشان نہیں
وکٹوریا گاڑیاں کرایہ پر چلتی ہیں۔ ان کے علاوہ بمبئی کی ہر دو لائنوں
یعنی بی بی اینڈ سی آئی آر اور جی۔ آئی۔ پی۔ آر کے تقریباً دو درجن
اسٹیشن ہیں۔ ان میں ایک ایک گھنٹہ کے تفاوت سے ٹرینوں کی
آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ لوگ دن رات اترتے چڑھتے ہیں

اسٹیشن کوئی قابلِ تعریف نہیں البتہ جی۔ آئی۔ پی کا آخری اسٹیشن
جسے وکٹوریا ٹرمنس یا بوڑی بندر کہتے ہیں۔ باہر سے نہایت عالیشان
معلوم ہوتا ہے۔ گویا ایک قلعہ گھرا ہوا ہے۔ مگر اندر ایک لمبی اور
اونچی دیوار یا پلیٹ فارم کے چبوترے کے سوا اور کچھ دکھائی
نہیں دیتا۔ ٹکٹ وغیرہ ملنے کی جگہ اور دفتر کے کمرے وسیع و بلند
ہیں۔ بمبئی میں سفید گلی بھی ایک خاص اور قابلِ ذکر جگہ ہے۔ یہاں
مختلف ممالک کی عورتیں ناجائز پیشہ کرتی ہیں۔

آخر میں اپنے جدید کرم گستر احباب کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے
سب سے پہلے حاجی تجمل حسین صاحب اس کے مستحق ہیں۔ انہوں
نے جس خلوصِ دلی سے مجھے مہمان رکھا۔ بمبئی جیسے شہر میں اس کی
اُمید کم ہو سکتی تھی۔ حاجی صاحب پُرگو و مشاق سخنور ہیں۔ کلام میں آمد ہی
آمد ہوتی ہے۔ قافیہ پیمائی سے آپ کی طبیعت کو زیادہ مناسبت ہے۔
بہت سے شاگرد بھی کر لئے ہیں۔ حیرت ہے آپ کا ایک دیوان بھی چھپ
چکا ہے۔ آپ نے اپنا فوٹو بطور یادگار مجھے عنایت فرمایا۔

مولوی محمد انور صاحب انور نے میری دعوتوں اور گاڑیوں کے
کرایہ وغیرہ میں جو کثیر رقم صرف کی ہیں اُسے کبھی نہیں بھول سکتا۔
انور صاحب نے مجھے ہمیشہ کے لئے اپنا گرویدۂ احسان بنا لیا۔ یہ سخن فہمی
اور شعر گوئی کا صحیح اور سچا مذاق رکھتے ہیں۔ بعض مرتبہ ایسا ہوا کہ میں نے
اپنے شعر کا پہلا مصرع پڑھا۔ دوسرا مصرع مجھ سے پہلے انہوں نے
پڑھ دیا۔ [illegible] سخن فہمی کی دلیل ہے۔ مولانا انور ایک باخبر

شاعر ہیں۔ اس عالم جوانی میں پھر اس زمانے میں ایسا نیک و خوش خلق انسان شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ اگر ان سے میری ملاقات نہ ہوتی۔ تو سیر بمبئی کا لطف آدھا رہ جاتا۔ میرے آخری زمانہ قیام بمبئی میں مولانا کے مدرسے کا امتحان تھا۔ اس لئے ان دنوں ان سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس رہا +

میر کاظم حسین صاحب ہدف لکھنوی اڈیٹر رسالہ غنچہ جاوید مجھ سے اس طرح ملے۔ گویا برسوں کے دوست تھے۔ انہوں نے اپنا قیمتی وقت سب سے زیادہ میرے پاس صرف کیا۔ ہدف صاحب نے بے تکلفانہ برتاؤ سے میرے دل کو اپنے تیر محبت کا نشانہ بنالیا جن دوستوں کو میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ انہیں میں ہدف صاحب بھی شامل ہیں۔ ان کی پر تکلف دعوت فراموش کرنے کے قابل نہیں۔ جس میں میرے علاوہ منشی افتخار علی صاحب جگر ابرار لکھنوی۔ حکیم عبدالحمید فرخ دہلوی مالک و اڈیٹر ہیچ بہار بھی شریک تھے ہدف صاحب لکھنوی ہیں۔ اس لئے اُن کے ہاں بات بات میں تکلف تھا +

سب سے آخر میں حکیم عبدالحمید صاحب فرخ مالک ہیچ بہار در بمبئی کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھ سے نہایت خوش خلقی کا برتاؤ کیا۔ اگرچہ آپ دفتر میں کم تشریف لاتے ہیں۔ مگر میری خوش قسمتی تھی۔ کہ میرے سامنے آپ دن اور رات کو اکثر تشریف لاتے رہے عجیب بامذاق اور خوش طبع بزرگ ہیں۔ کوئی بات ظرافت سے

خالی نہیں ہوتی۔ آپ کے بعض ظریفانہ فقرے مجھے عرصہ تک یاد رہیں گے۔ آپ کے ساتھ آپ کے ملازم بھی مجھ سے محبت کرنے لگے۔ جن میں منشی عبدالصمد صاحب منیجر کارخانہ مہاراج بہادر اور منشی عبدالرشید صاحب خوشنویس قابل تذکرہ ہیں۔ اگر یہ لوگ مجھ سے مہربانی کا برتاؤ نہ کرتے تو پنچ بہادر کے دفتر میں میرا قیام مشکل تھا۔ سورت سے بمبئی کا کرایہ عہ/ ہے ؎

بُرہان پور

۳۔ جون کو بمبئی کے مشہور اسٹیشن وکٹوریا ٹرمینس (بوری بندر) سے بُرہان پور کا ٹکٹ لیا۔ میر کاظم حسین صاحب ہادف لکھنوی مجھے گاڑی میں بٹھانے آئے۔ ساڑھے سات بجے صبح کے ٹرین روانہ ہوئی۔ رستے میں کلیان سے اگت پوری تک عجیب پیچ در پیچ رستہ طے کرنا پڑا۔ گاڑی کسی جگہ زمین میں اُترتی چلی گئی کہیں بلند ہوئی تو ایسی کہ زمین کی طرف دیکھنے سے خوف معلوم ہوتا تھا۔ خصوصاً جب گاڑی ایک بلند پہاڑی نالے کے پُل سے گزری تو اکثر ڈرپوک دہل گئے۔ آٹھ ساڑھے آٹھ بجے دن کا وقت۔ تمام گاڑی میں لالٹینیں روشن۔ انجن دھوئیں اڑاتا اور پھک پھک کرتا اندھیری سُرنگوں سے گزرنے لگا۔ تمام مسافر کھڑکیوں سے سر نکال کر دیر تک یہ تماشا دیکھتے رہے۔ اس مقام پر ریل ۱۲-۱۴ سُرنگیں طے کرتی ہے۔ اگت پوری پہنچکر لالٹینیں گل کر دی جاتی ہیں۔ پہاڑ بعد میں بھی آتے ہیں۔ مگر کمی

ہوتی چلی جاتی ہے۔ قصہ مختصر میں شام کے سات بجے بُرہان پور پہنچگیا
اسٹیشن سے شہر ۳ میل کے فاصلہ پر ہے۔ عموماً بیل گاڑیاں مسافروں
کو لاتی لے جاتی ہیں۔ چرّخ چوں۔ چرّخ چوں آہستہ آہستہ چل کر ۹ بجے
کے بعد شہر کے دروازہ پر پہنچے۔ یہاں سب سے پہلے منشی محمد فخر الدین صاحب
حاذق بُرہان پوری سے ملاقات ہوئی۔ یہ صاحب فوراً مجھے اپنے مکان
پر لے گئے۔ اور تین روز بخندہ پیشانی مہمان رکھا۔ اگلے روز جمعہ سے
پہلے میں نے حضرت شاہ بھکاریؒ اور دیگر اولیاء اللہ کے مزاروں کی
زیارت کی۔ جمعہ کے بعد دیگر شعرائے بُرہان پور سے ملاقات ہوئی۔
جن میں موسیٰ بھائی صاحب مائل گھڑی ساز قابل تذکرہ ہیں۔ آگرہ کے
ایک ویٹرنری ڈاکٹر صاحب سے بھی ملنے کا اتفاق ہؤا۔ افسوس ہے
ان کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ سُنا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ظریفانہ رنگ میں
اچھا کہتے ہیں۔ میں نے ان کا کلام نہیں سُنا۔ برہان پور اگرچہ ذرا سا
قصبہ ہے۔ مگر یہاں شاعروں کی خاصی کثرت ہے۔ ہم قافیہ تخلص
کے ایسے شاعر بآسانی مل جائیں گے۔ جن کا ایک ایک تخلص لینے سے
غزل پوری ہو سکتی ہے۔ مثلاً ہلالی قافیہ ہے تو خیالی۔ ہلالی تخلص کے
بہت شاعر دستیاب ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح طالب کے وزن پر راغب
طالب وغیرہ۔ ہمارے مہربان حاذق صاحب کی اُمّت بھی کم نہیں
شایق۔ شارق۔ عاشق وغیرہ آپ کے بہت سے شاگرد ہیں۔ ناواقف
اور مبتدی سخن طراز اگر شعرائے بُرہان پور کے تخلص حفظ کر لیں۔ تو
بہت سے قافیوں پر عبور ہو جائے ؎

۱۱-جون کی شب کو مشاعرہ تھا۔ اس کے لیے حسب ذیل نوٹس شائع و تقسیم کئے گئے۔

حضرات۔ منشی وجاہت حسین صاحب وجاہت جھنجھانوی اڈیٹر رسالہ اصلاح سخن لاہور حضرت داغ مرحوم کے شاگرد رشید برہان پور تشریف لائے ہیں۔ اور شاعر یکتا مانے جاتے ہیں۔ لہذا یہ مشاعرہ خاص انہیں کے واسطے قرار دیا گیا ہے۔ امید کہ آج آٹھ بجے شام کو تکیۂ پہلو میں تشریف لائیں۔ مصرع طرح ہے

تابوت مرا تخت سلیماں نظر آیا بیاباں غیر قافیہ

غزل درج کرنے سے پہلے یہ لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ بعض احباب برہانپور نے مجھے وجاہت حسین یقین کرنے میں تامل کیا تھا۔ چنانچہ مقطع میں اسی کا تذکرہ ہے:

کچھ عشق میں راحت کا نہ ساماں نظر آیا
مشکل ہوا وہ کام جو آساں نظر آیا

جز میں بھی ہمیں کل ہی نمایاں نظر آیا
جس گل پہ نظر کی وہ گلستاں نظر آیا

اک رنگ میں دیکھے ترے سب [illegible]
ہندو نظر آیا نہ مسلماں نظر آیا

دیکھا ہے انہیں غیر کے پہلو میں شب ہجر
مجھ کو یہ عجب خواب پریشاں نظر آیا

عشق لب شیریں نے بنالی ہے دم پر
عیسیٰ بھی مری جان کا خواہاں نظر آیا

وحشت میں جنوں کی ہوئی حد دست درازی
دامن نظر آیا نہ گریباں نظر آیا

ثانی نہیں دنیا میں کوئی پیر مغاں کا
یہ ایک سمجھ بوجھ کا انساں نظر آیا

ہے تاک مرے دل کی کسی دزد نظر کو
اس مال کا یہ چور نگہباں نظر آیا

وہ ایک ہی تو جلوہ ہے اے شیخ و برہمن
جو کعبہ و بتخانہ میں یکساں نظر آیا

تو نے جسے دیکھا وہ ہوا محو تحیر
سکتے میں ہے آئینہ بھی حیراں نظر آیا

افسوس مرے دل پہ کیا قبضہ بتوں نے
کعبے میں بھی کوئی نہ مسلماں نظر آیا

صد شکر ہیں موجود یہاں حضرت زاہد
میخانے میں اک مرد مسلماں نظر آیا

پھر جوش پہ ہے دیدۂ تر ہجر صنم میں
پھر آج سمندر میں یہ طوفاں نظر آیا

راس آئی نہ الفت ہمیں اس چاہ ذقن کی
ہم مر گئے جب چشمۂ حیواں نظر آیا

حیران ہوئے دیکھ کے وہ مجھ کو وجاہت
کہتے ہیں یہ کم عمر سخنداں نظر آیا

مشاعرے میں سامعین و شعراء کا اچھا مجمع تھا۔ احباب کے اصرار سے مجھے چند غیر طرح غزلیں بھی پڑھنی پڑیں۔ بارہ بجے شب تک اچھی کیفیت رہی ✦

برہان پور مختصر مگر آباد قصبہ ہے۔ مکانات عموماً کھپریل کے ہیں۔ یہ ملک متوسط کا علاقہ ہے۔ یہاں عزیز مہمان کو پہلے دودھ چاول کھلایا جاتا ہے۔ جامع مسجد نہایت عالی شان و وسیع ہے۔ باشندے منکسر المزاج اور خلیق ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کی کمی ہے۔ منشی محمد فخر الدین صاحب حاذق یہاں اچھے سخنور ہیں۔ آپ حضرت شمشاد لکھنوی سے سلسلۂ تلمذ رکھتے ہیں۔ نہایت سنجیدہ و مہذب بزرگ ہیں۔ میں ان سے نیاز حاصل کر کے بہت خوش ہوا۔ ان کی مہماں نوازی ہمیشہ یاد رہے گی۔ اسی طرح خدا بخش صاحب عاشق اور میاں فضل حسین صاحب کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ منشی عبد العزیز خاں صاحب مختار شاگرد حضرت احسن مارہروی بھی قابل شکریہ ہیں کہ تکلیف اٹھا کر مجھ سے ملنے آئے۔ باقی احباب کے نام مجھے یاد نہیں رہے کیونکہ سرسری یا ایک دفعہ کی ملاقات کسی وجہ سے بغیر مستحکم نہ ہو سکی۔ بمبئی (وکٹوریا ٹرمینس) سے برہان پور کا راستہ [illegible] ہے ✦

بھوپال

۸ جون کو شام کے ساڑھے سات بجے سلطان پور سے بھوپال کا ٹکٹ لیا۔ حضرت حاذق و دیگر احباب اسٹیشن تک پہنچانے آئے۔ رات کا وقت تھا۔ اتفاق سے ریل کا درجہ بھی خالی ملا۔ میں نے خوب لمبی تان دی۔ صبح کے تین بجے بھوپال پہنچ کر گاڑی سے اترا۔ پہنچنا ناوقت تھا۔ اس لئے صبح تک مسافر خانے میں قیام کیا۔ دن نکلنے کے بعد ایک ٹم ٹم پر اسباب رکھ کر شہر کی راہ لی۔ اور گاڑی والے سے کہہ دیا کہ سرا میں پہنچا دے۔ میں سمجھتا تھا کہ بھوپال دہلی و لاہور کے برابر پر رونق شہر ہوگا۔ اسلئے رستہ میں ادھر ادھر غور سے دیکھتا چلا گیا۔ مگر وہ مولوی مدن کی سی بات معلوم ہوتی۔ خیال کرتا تھا کہ شاید آگے چل کر کچھ اچھے آثار نظر آئیں۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا۔ کہ گاڑی والے نے کہا حضرت اتریئے۔ یہ سامنے سرا موجود ہے میں نے اپنا اسباب ایک کوٹھری میں مقفل کیا۔ اور شہر کی سیر کو چل کھڑا ہوا۔ جمعرات کی سرا سے شہر پناہ نزدیک ہے۔ اس لئے جلد ایک دروازہ سامنے آ گیا میں بڑے شوق و امید سے اندر داخل ہوا۔ مگر کوئی دلکش بات دیکھنے میں نہ آئی۔

۱۰ جون سنہ ۱۹۱۵ء کو بھوپال میں مشاعرہ تھا۔ جناب سید محمد صاحب شہید لودی نے مجھے اس مضمون کا خط لکھا۔

اے محترم مسافر

تسلیم آج مجھے آپ کی تشریف آوری کی خبر ملی۔ میں سخت عدیم الفرصت ہوں۔ کیا اچھا ہو اگر آپ آج شب کو ۹ بجے مشاعرہ میں جو میں نے

اب اُن کو مجھ سے محبت ہے میں ہوں بچرا کبھی حرم میں وجاہت تو دیر میں کبھی	بڑا مزہ ہے جو کچھ دن یہ انقلاب رہے یہ بُت بھی میری طرح خانماں خراب رہے

مشاعرہ اچھی دھوم دھام اور اعلےٰ اہتمام سے ہوا تھا۔ شعرائے بھوپال کے علاوہ مولوی محمد عبدالواسع صاحب صفا شاگرد حضرت امیر مینائی بھی شریک تھے۔ اس مشاعرہ میں اکثر شعرا اپنے مطبوعہ اور قلمی دیوان لے کر آئے تھے۔ جب اُن کا نمبر آتا تھا۔ تو کتاب کھول کر بیٹھ جاتے تھے۔ پہلے ایک آدھ غیر طرح پھر طرح پر غزل پڑھتے تھے۔ بعض صاحبان نے مخمس بھی پڑھے۔ اس لئے مشاعرے کو غیر معمولی طوالت ہوئی۔ صرف میں ہی ایک ایسا شاعر تھا۔ جس نے غیر طرح غزل نہیں پڑھی *

بھوپال کو میں نہایت آباد و پر رونق شہر سمجھتا تھا۔ مگر آ کر دیکھا تو نام بڑا اور درشن چھوٹے کا مصداق ثابت ہوا۔ مکانات عموماً کھپریل کے ہیں۔ جو زیادہ اونچے نہیں۔ سڑکوں پر جابجا سُرخی کُٹی ہوئی ہے۔ سفید کپڑے پہن کر جائیے۔ تو پاجامہ گھٹنوں تک لال ہو جائے۔ روشنی اور چھڑکاؤ کا بھی کافی انتظام نہیں کسی مکان میں بیٹھیے تو کھپریل کے کھپروں سے گرد گر کر تمام کپڑے گرد آلود ہو جائیں۔ تمام شہر نہایت بدصورت و بے رونق معلوم ہوتا ہے۔ البتہ شاہی محلات اور بعض پبلک عمارات خصوصاً مساجد بہت عالیشان ہیں۔ جو شہر کے کھپریلی کوٹھڑوں میں اَن مل بے جوڑ سی کھائی دیتی ہیں۔ وہ تاج المساجد بھی دیکھی جس کے لئے ولایت سے بلور کا فرش آیا تھا۔ میں حیران ہوا کہ اس شہر میں ایسی مسجد کی کیا ضرورت تھی۔ سابق بیگم صاحبہ نے اس کی تیاری میں کروڑوں روپیہ صرف کر دیا ہے۔ کار تعمیر اب

بھی جاری رہتا ہے۔ مگر اس کی رفتار بہت دھیمی ہے۔ یہ مسجد پتھر کی بنی ہوئی ہے کرسی وسیع کر ذرا اونچی بنائی گئی ہے۔ بعد تیاری قابل دید شے ہوگی۔ اگرچہ اب بلّور کا فرش اس میں نہ ہوگا۔

بھوپال میں منشی سید امداد علی صاحب عیش کا دم غنیمت ہے۔ آپ آزاد تو فقیرانہ بلکہ ایک حد تک وحشیانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ کیونکہ شہر سے باہر ایک کوٹھڑی میں رہتے ہیں۔ ایک دن سرخ رنگ کا نہایت شوخ پاجامہ پہن کر مجھ سے ملنے تشریف لائے۔ میں نے کہا عیش صاحب آج تو آپ نے لال پری کو مات کر دیا۔ کہنے لگے اگر سبز رنگ کا کپڑا ہو۔ تو اس کے پہننے میں مضایقہ نہیں۔ پھر آپ میرے پاجامہ پر کیوں معترض ہیں۔ عیش صاحب کی صورت وحالت دیکھ کر مجھے بہت تعجب ہوا۔ کہ آپ باایں ہیئت کذائی جانشینی داغ کے مدعی ہیں۔ میں نے عیش صاحب کا فوٹو بھی حاصل کیا۔ انشاءاللہ کسی موقع پر ناظرین کو زیارت کرائی جائے گی۔

سیّد محمد یوسف صاحب قیصر بھوپالی سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ آپ وجیہ نوجوان ہیں۔ طبیعت میں شہرت پسندی کا مادہ ہے۔ ان کی عربی استعداد خاصی معلوم ہوتی ہے۔ انگریزی میں بھی دخل رکھتے ہیں۔ نثر اچھی لکھ لیتے ہیں نظم میں اگرچہ نومشق ہیں۔ مگر طبیعت بری نہیں۔ میں ان سے مل کر بہت محظوظ ہوا۔

منشی سید حسن صاحب سیّد منشی مال ریاست بھوپال مولانا ظہیر دہلوی مدظلہ کے شاگرد ہیں۔ انہوں نے اچھی طبیعت پائی ہے۔ مہمان نواز و خلیق آدمی ہیں۔ انہیں کے مکان پر منشی منولال صاحب بسمل سے ملاقات ہوئی

اور پولیٹیکل معاملات پر غیر رسمی گفتگو رہی۔ میں انکی مہربانی کا شکرگزار ہوں ۔
حافظ محمد سیف الرحمن صاحب خالص بھوپالی۔ آپکی ظاہری آنکھیں بے بصارت ہیں۔ مگر باطن کا پردہ کھلا ہوا ہے۔ آپ مجھ سے بخلوص دل ملے۔ بھوپال میں آپ کا وجود بھی غنیمت ہے۔ تفسیر اور حدیث دونوں میں فکر فرماتے ہیں۔ اور اچھے شعر نکال لاتے ہیں ۔

بسمل صاحب بھوپالی سے بھی ملاقات ہوئی۔ مگر انہوں نے مجھے منع کر دیا تھا کہ سفرنامہ میں میرا حال نہ لکھا جائے۔ وجہ ان کا دل جانتا ہوگا۔ بہرحال میں انکو بھول نہیں سکتا ۔

مولوی سید محمد صاحب مشہدی ٹونکی سے سرسری ملاقات کئی مرتبہ ہوئی اسی طرح ایک آدھ مرتبہ حافظ حفظ الکبیر صاحب ہلال میرٹھی بھی ملے ۔

بھوپال میں زنانہ کی دیکھا دیکھی اب مرد ریشمی اور رنگین و شوخ رنگ کے پاجامے کم پہنتے ہیں۔ پہلے مردوں عورتوں کا یکساں لباس تھا۔ غالباً اسی وجہ سے یہ پاجامہ مشہور ہے ۔

لطیفہ۔ جہاں پور میں بعض احباب نے مجھ سے پوچھا کہ بھوپال جا کر کیسی کیسی شاعروں سے ملنے گئے ہیں۔ میں نے کہا فلاں بھوپالی اور فلاں بھوپالی ایک صاحب بولے آپ نے حضرت مغفور بھوپالی کی زیارت نہ فرمائی۔ یہاں نامرد اور زنخا کو بھوپالی کہتے ہیں ۔

بھوپال کے اصلی باشندوں کی اخلاقی حالت بہت بہتر نہیں۔ آوارہ مزاج عورتوں کی کثرت ہے۔ سنتا ہے بھوپال کا پانی قوت مردمی کو زائل کرتا ہے میں اس تاریک پہلو کا ذکر نہ کرتا۔ مگر جب بھوپال کی یہ خصوصیت ہندوستان میں

عام طور سے مشہور ہے تو عوام الناس کی آگاہی کے خیال سے ایسا لکھنا ضروری
سمجھا گیا۔ ورنہ وجاہت ان باتوں کا رسیا نہیں۔ برہان پور سے بھوپال کا
کرایہ ۶؎ ہے ؛

آشٹہ

۱۵ جون کو ۴ بجے کے قریب بھوپال اسٹیشن سے سوار ہو کر سیہور پہنچا
بھوپال سے آشٹہ ۵۰ میل ہے۔ ۲۳ میل یعنی سیہور تک ریل جاتی ہے۔
۲۷ میل کا سفر گاڑی یا تانگے میں طے کرنا پڑتا ہے۔ مگر یہ اتفاق کی بات تھی
کہ میں جس روز آشٹہ جانا چاہتا تھا اس دن کوئی تانگہ یا گھوڑا گاڑی نہ ملی
بیل گاڑیاں تھیں جو کم رفتار ہونے کی وجہ سے رات کے ۸-۹ بجے آشٹہ
پہنچاتیں۔ بیٹھے بیٹھے تکان ہوتی وہ مزید برآں۔ اس لئے میں نے بیل گاڑی
میں سوار ہونا پسند نہ کیا۔ اپنا ٹرنک بھوپال ہی چھوڑ آیا تھا۔ لہٰذا ۲۷ میل
کی سخت منزل طے کرنے کے لئے سیہور سے پیدل چل پڑا۔ جب عصر
مغرب کے درمیان بیسویں میل پر پہنچا تو یہاں سڑک پر ضلع کوٹری کی
پولیس چوکی نظر آئی۔ میں پانی پینے کے لئے ٹھہر گیا۔ حسن اتفاق سے
ماسٹر شیخ اکرم صاحب اکسائز انسپکٹر ریاست بھوپال تشریف فرما تھے۔
انھوں نے میرا نام و نشان پوچھا۔ اور بعد اصرار مجھے پولیس میں ٹھہرا لیا۔ کوٹری ایک
ذرا سا گاؤں ہے۔ کھانے پینے کی چیزیں مشکل سے دستیاب ہوتی ہیں مگر
ماسٹر صاحب موصوف نے بہ عجلت تمام سامان بہم پہنچا لیا۔ کھیر پکوائی گئی۔ آم
منگائے گئے جو میں نے خوب سیر ہو کر کھائے۔ ٹھیکی کے لئے اُم کھانے کا یہ

دوسرا موقع تھا۔ رات کو سوتے وقت ایک حجام بلایا جو دیر تک میری ٹانگیں دباتا رہا۔ ماسٹر صاحب دہلی کے باشندے ہیں۔ مجھے آپ کی ملاقات پر ہمیشہ فخر رہیگا۔ ایسے خلیق و مہمان نواز اس زمانے میں بہت کم ہیں۔ ایک ہندو ٹاکر دار صاحب بھی جن کا نام شاید گوکل پرشاد ہے۔ میری دلی شکرگزاری کے مستحق ہیں۔ انہوں نے میرے لئے بان وغیرہ کا انتظام کیا۔ جو ایسے گاؤں میں باسانی ممکن نہ تھا۔ ۱۵ ۱۱جون کو دن نکلنے سے پہلے روانہ ہو کر ۸ بجے آشٹہ پہنچ گیا۔ کیونکہ ۷-۸ میل جگہ باقی تھی جو جلد طے ہو گئی +

میں اس جگہ اپنے ہم وطن پیرجی ظہور الحسن صاحب مختار و مستاجر سے ملنے آیا تھا۔ یہ اس روز اپنے علاقے (جاورہ) میں گئے ہوئے تھے۔ جو آشٹہ سے ۱۲ میل ہے۔ میں فوراً ہی منشی محمد یعقوب صاحب وکیل کے مکان پر پہنچا۔ انہوں نے نہایت خوش اخلاقی سے مجھے دو دن اپنے ہاں مہمان رکھا۔ تیسرے روز ہماے پیرجی صاحب تشریف لے آئے ۸ دن انہوں کے آنے تک پیرجی صاحب فکر سخن بھی فرماتے ہیں۔ ہیں اور وہ ایک زمانے میں ہم سبق تھے۔ پیرجی صاحب کی خوشحالی دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ آپ نے کام میں بھی اچھا رسوخ پیدا کیا ہے۔ اور کئی مکانات ذاتی بنا لئے ہیں۔ انہوں نے میری تواضع و مدارات میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ اللہ تعالے کاروبار میں روز افزوں ترقی کرے۔ آمین

منشی محمد یعقوب بھی شکرگزاری کے مستحق ہیں کہ انہوں نے نہایت خلوص سے میری مہمان نوازی کی۔ حقیقت لیاقت منشی صاحب کے بھائی عکر .... نواب میاں کی خوش خلقی بھی قابل شکریہ ہے۔ آپ مجھے کئی مرتبہ باخوار اپنے

لے گئے اور آم جامن کھلائے۔ بابو لطافت حسین صاحب برانچ پوسٹ ماسٹر اچھی دل لگی اور مذاق کے آدمی ہیں۔ ان کی وجہ سے اچھی دلبستگی رہی۔ آشٹہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ کچھ حصہ بلندی (قلعہ) پر واقع ہے یہیں تحصیل و نظامت بھی ہے۔ بھوپال کے علاقے میں نہریں نہیں۔ مگر یہاں کی زمین کو بارش کا تھوڑا سا پانی کافی ہے۔ پیداوار میں ہر قسم کا غلہ بافراط پیدا ہوتا ہے۔ سنا ہے یہاں سال میں تین فصلیں ہوتی ہیں ۔

گوالیار

۲۵ جون کو آشٹہ سے چل کر بھوپال آیا۔ اس مرتبہ آشٹہ سے سیہور تک پیر جی ظہور الحسن صاحب نے دو گھوڑوں کا ایک تانگہ میری سواری کے لئے تجویز کر دیا تھا۔ میں اس پر سیہور تک تنہا بیٹھا چلا آیا۔ رات کے ۸ بجے بھوپال پہنچکر ۲۶ جون کو قیام کیا۔ ۲۷ کو چلنے کا ارادہ تھا۔ مگر بارش کی وجہ سے دن کو رکنا پڑا۔ صبح کے تین بجے بھوپال سے سوار ہو کر ۱۲ بجے دن کے گوالیار پہنچا۔ جب اسٹیشن سے اترا تو خوب بارش ہو رہی تھی آخر اسٹیشن کی متصلہ سرا میں قیام کیا۔ شام تک بارش ہوتی رہی۔ اگلے روز یعنی ۲۸ جون کو منشی قاضی عزیز الدین صاحب رخشاں جیپوری سے ملاقات ہوئی۔ ان کا پتا حضرت اشک بلند شہری نے دیا تھا۔ رخشاں صاحب گوالیار میں معزز عہدہ دار ہیں۔ یہ مجھ سے نہایت خلق و مہربانی کے ساتھ پیش آئے۔ مجھے کئی روز تک بخندہ پیشانی مہمان رکھا۔ اشک صاحب کا

شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ایک اچھے جنٹل مین سے مجھے ملوایا۔ ان کے علاوہ منشی سید معشوق حسین صاحب اطہر ہاپوڑی وکیل گوالیار سے بھی نیاز حاصل کرکے طبیعت بہت خوش ہوئی اطہر صاحب باخبر اور تجربہ کار سخنور ہیں۔ مجھے شیخ ضیاء الحق اور میر معشوق حسین صاحب کے دیکھنے کی مدت سے حسرت وتمنا تھی۔ ایک آرزو اجمیر میں پوری ہوئی اور دوسری گوالیار میں۔ اطہر صاحب خوش خلق اور مہمان نواز آدمی ہیں۔ اُنہوں نے ہائی کورٹ میں لے جاکر عدالت کے سب چھوٹے بڑے کمروں کی سیر کرائی۔ ان کی یہ عنایت قابل شکر گزاری ہے ۔

مولوی حکیم محمدؐ ناصر حبیب صاحب وکیل بھی شکریہ کے مستحق ہیں کہ آپ نے مجھ غریب الوطن کا اعزاز کیا۔ اور مہمان نوازی میں حصّہ لیا۔ حکیم صاحب الفربہ خواہ مخواہ مرد آدمی ہونے کے علاوہ اس لحاظ سے بھی ایک غیر معمولی بزرگ ہیں۔ کہ آپ حکیم مومن خاں مرحوم کے نواسے ہیں۔ مجھے آپ سے نیاز حاصل کرنے کا ہمیشہ فخر رہے گا۔ عبدالحکیم خاں نشتر یکہ سے مل کر بھی طبیعت خوش ہوگئی ۔

پنڈت نراین پرشاد صاحب مہر مترجم کتاب رہنمایان ہند سے ان کے مکان پر جاکر ملاقات کی۔ آپ لٹریری معاملات میں سلجھے ہوئے آدمی ہیں۔ آپ نے اپنا کلام بھی سنایا مجھ سے بھی سُنا۔ تھوڑی دیر تک اچھی کیفیت رہی ۔

گوالیار سے میری مراد ہر جگہ لشکر گوالیار سے ہے۔ کیونکہ میں شہر میں نہیں گیا۔ لشکر کے بازار کشادہ اور دلفریب ہیں۔ مگر آدمیوں کی

کمی ہے۔ اکثر دکانیں بند پڑی رہتی ہیں۔ ہر بازار میں برقی روشنی کا انتظام ہے۔ تار برقی کے کھمبے سڑکوں اور بازاروں میں بہت خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ یہ سب مہاراجہ صاحب کی بیدار مغزی کا نتیجہ ہے۔ مگر افسوس ہے کہ بازاروں کے پچھواڑے بہت چھوٹے چھوٹے اور غلیظ مکان بنے ہیں۔ گوالیار کی حالت اس مصرع کی مصداق ہے ؎

گھر کے اندر ہے اندھیرا اور باہر چاندنی

کچہریاں۔ ہسپتال۔ مارکٹ۔ تھیٹر کی عمارات قابل دید ہیں۔ یہاں ایک پہاڑی پر قلعہ بھی ہے۔ جو ریل میں کئی میل سے دکھائی دیتا ہے۔ اس میں اعضا تراشیدہ سنگین بتوں کا منظر قابل دید ہے۔ گوالیار میں مجھے گرمی کی سخت تکلیف محسوس ہوئی۔ بھوپال تک نہایت خوشگوار موسم رہا یہاں مچھر کثرت سے ہوتے ہیں۔ ہوا میں بھی خون پیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس کی بابت کسی ان گھڑ شاعر کا شعر مشہور ہے ؎

چار چیز است تحفۂ لشکر
گرد و گرما و کیچڑ و مچھر

صحیح شعر ملتان کی نسبت اس طرح سنا ہے ؎

چار چیز است تحفۂ ملتان
گرد و گرما گدا و گورستان

بحالت مجموعی لشکر گوالیار اچھی جگہ ہے۔ بھوپال سے تیسرے درجے کا کرایہ ۱۱؎ ہے ؞

ہاتھرس

میرا لٹریری سفر گوالیار تک ختم سمجھنا چاہئے۔ اگرچہ میں نے واپسی میں آگرہ اور متھرا بھی کچھ قیام کیا۔ مگر آگرہ کا مفصّل حال پہلے لکھا جا چکا ہے۔ اس لئے یہاں اس کی ضرورت نہیں۔ گوالیار سے آگرہ کا راستہ اہم ہے۔ ارادہ تو یہی تھا کہ براہ راست دہلی چلا جاؤں۔ مگر راہ میں ایک پیچ پڑا ہوا تھا۔ وہ یہ کہ ہاتھرس میں میرے تایازاد بھائی منشی محمدؐ ابراہیم صاحب واصلباقی نویس ہیں۔ اخیر مارچ میں جب مارہرہ سے آگرہ آنا ہوا تو ہاتھرس اسٹیشن سے گاڑی گذری۔ بعض وجوہ سے میں اُس وقت وہاں نہ اُترا۔ اگر اب بھی بالا بالا چلا جاتا۔ تو شاید ہمارے برادرِ معظّم کو شکایت ہوتی یا نہ ہوتی۔ مگر مجھے ضرور افسوس رہتا۔ اس لئے میں ۵ رکے پیچھے دیکر آگرہ سے متھرا آیا۔ اور متھرا جنکشن سے ہم دوسرے کر رات کے ۹ بجے ہاتھرس پہنچا۔ منشی محمدؐ ابراہیم صاحب بارہ تیرہ سال سے ضلع علی گڈھ میں بعہدہ واصلباقی نویس متعین ہیں۔ مگر مجھے کبھی ان کے پاس آنیکا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اگر یہ موقع بھی چوک جاتا۔ تو پھر خدا جانے کب مہورت کھلتی +

ہمارے بھائی صاحب بڑے روز کے واصلباقی نویس ہیں۔ آپ کی باتیں سن کر ایک ناواقف آدمی آپ کو اعلےٰ درجے کا مشّیخت مآب سمجھ سکتا ہے۔ مگر واقعی بات یہ ہے۔ کہ آپ بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں آپ کی سخن سازی بے معنی نہیں ہوتی۔ ہمارے خاندان میں آپ کی منکسر المزاجی۔ خوش خلقی و سادگی اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ اللہ تعالیٰ دن دُگنی

رات چوگنی ترقی عطا کرے آمین ÷

منشی عماد الدین صاحب پیشکار تحصیل خصوصیت سے قابل تذکرہ ہیں ان کو میرے منظوم سفرنامہ موسوم بہ جھنجھانہ سے لاہور تک (مطبوعہ اصلاح سخن دسمبر ۱۹۰۸ء) کا یہ مصرع برزبان ہے ۔

کہ تھا فیاض سے ملنا ضروری

جب آپ مجھ سے گفتگو فرماتے ۔ تو اس مصرع کو ضرور پڑھتے ۔ یہ گویا اُن کی ٹیپ کا بند تھا ۔ مجھے انہوں نے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ سفرنامہ میں میری بُرائی نہ لکھنا ۔ آجکل مجھے بار بار وہی بات ہے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ پیشکار صاحب میں کچھ بُرائیاں ہونگی ۔ مثل مشہور ہے چور کی ڈاڑھی میں تنکا ۔ مگر میں نے اُن میں کوئی بُرائی نہیں دیکھی ۔ میرے نزدیک منشی عماد الدین صاحب پُرانی وضع کے مہذب اور نیک دل بزرگ ہیں ۔ ان کی نسبت بُرائی کا احتمال کرنا بھی اخلاقی جرم ہے ÷

۱۸ ۔ جولائی کو بابو آسارام صاحب تحصیلدار ہاتھرس نے قصبہ ڈاسنی میں جو علی گڈھ سے ۱۳ اور ہاتھرس سے ۷ میل کے فاصلہ پر ایسٹ انڈین ریلوے کا اسٹیشن ہے ۔ آموں کا نوروز منایا ۔ علی گڈھ کے معزز اہلکار مثل سب جج ۔ و ڈپٹی کلکٹر و وکلاء وغیرہ بھی اس میں شریک ہوئے ۔ انکے علاوہ ہاتھرس کے اہلکار مثل منصف وسکرٹری میونسپلٹی ۔ انسپکٹر و سب انسپکٹر پولیس ۔ و اصلاباتی نویس ۔ سیاہہ نویس ۔ وغیرہ جشن میں شریک ہوئے ۔ تحصیلدار صاحب موصوف نے مجھے بھی چلنے کے لئے کہا ۔ چنانچہ ہاتھرس سے سب لوگ فٹنوں میں

سوار ہوکر ڈاسنی گئے۔ ایک باغ میں آموں کا کافی ذخیرہ فراہم کیا گیا تھا اس کے علاوہ پوری۔ کچوری۔ مال پوڑے اور کھیر بھی تیار کرائی گئی۔ دوپہر سے شام تک بھانڈوں اور رنڈیوں کا ناچ ہوتا رہا ؞

تحصیلدار صاحب کی اولوالعزمی اور عالی ہمتی و فیاضی سے آج کا دن خوب لطف سے بسر ہوا۔ ۹ بجے کے قریب سب لوگ اپنے اپنے گھر واپس چلے گئے۔ میں اور میرے برادر معظم منشی محمد ابراہیم صاحب واصلباقی نویس ۲۰ جولائی کو اپنے وطن جھنجھانہ آئے۔ میں چندروز اپنے گھر مقیم رہ کر ۱۳۔ اگست کو لاہور واپس آگیا ؞

خاتمہ

میں مارچ سے جولائی تک یعنی کم وبیش پانچ مہینے سفر میں رہا۔ اور مجموعی حیثیت سے ڈھائی تین ہزار میل طے کئے۔ سفر کی غرض تبدیل آب وہوا و ترقی اشاعت رسالہ اصلاح سخن تھی۔ مگر افسوس ہے کہ لاہور چھوڑ دینے کے بعد صرف مارچ اور اپریل کے دو پرچے بمشکل شائع ہوئے۔ وہ بھی مارچ کا اپریل میں اور اپریل کا جون میں۔ ظاہر ہے۔ کہ ایسی حالت میں خریداروں کو بدگمانی پیدا کرنے کا موقع مل گیا۔ احباب کو شک گزرا کہ خدا جانے رسالہ جاری رہے یا نہیں چنانچہ اثنائے سفر میں اکثر لوگوں نے یہی خیال ظاہر کیا کہ رسالے کی اشاعت کا انتظام درست ہو جائے۔ تو ہمارے نام ویلیو بھیجدیا جائے۔ اس طرح پونے دوسو کے قریب نام لکھ لئے گئے۔ اب ان میں سے جتنے لوگوں سے چندہ وصول ہو جائے۔ وہی مستقل تعداد سمجھنی چاہئے *

اس میں شک نہیں میں نے اس سفر میں ہر جگہ زیادہ قیام کیا۔ مگر اس کی وجہ محض ایام گزاری نہ تھی بلکہ زیادہ تر یہ خیال تھا کہ روز روز کون سفر کرتا ہے اس لئے جدید احباب سے رشتہ اتحاد ایک ہی دفعہ مضبوط کر لینا چاہئے۔ مگر با ایں اہتمام و انتظام مجھے اُمید نہیں کہ بعض احباب سے جیتے جی پھر کبھی ملاقات ہو سکے۔ یوں خدا کو سب قدرت ہے۔ آہ یہ کیسا دل شکن خیال ہے لیکن انسان کو "دنیا باُمید قائم" کے مقولہ پر نظر رکھنی چاہئے مثل مشہور ہے۔ یار زندہ صحبت باقی *

میں آخر میں اپنے جملہ احباب کے لئے صحت و سلامتی کی دعا کرتا ہوں *

قطعۂ تاریخ از نتیجہ سخنور مرتاض جناب فیاض فاروقی مقیم چھچھور

ہے حکم خدا کا یہ کرو سیر[۵] جہاں کی ‎ ‎ اب گھر سے نکلنا نہیں کچھ دیس نکالا

ہوتی ہے طبیعت کو بہت سیر سے فرحت ‎ ‎ ہو جاتا ہے امراض کا پھرنے سے ازالا

دولت کی ہو گر چاہ تو پردیس میں جائے ‎ ‎ لازم ہے یہ ہر اک کو مسلماں ہو کہ لالا

یہ سچ ہے ضروری ہے بہت سیر ممالک ‎ ‎ کچھ شک نہیں اس میں۔ مگر اے حضرت والا

دشوار ہے ہر شخص کو ہو شوق سیاحت ‎ ‎ گھر چھوڑ کے پھرنا نہیں کچھ منہ کا نوالا

ہیں خرچ کو درکار ہزاروں کے سفر میں ‎ ‎ ہر سمت سے آواز یہ آتی ہے کہ لا۔لا

اس پر بھی بہت لوگ ہیں ایسے کہ جنہوں نے ‎ ‎ شغل سفر و سیر میں ہے ہوش سنبھالا

ان میں سے وجاہت بھی ہیں اک مرد دلاور ‎ ‎ اللہ نے بخشی ہے انہیں ہمت والا

ہے روز ولادت سے انہیں شوق سیاحت ‎ ‎ آگاہ ہے اس بات سے ہر جاننے والا

گئے ہیں ابھی ہند جنوبی کے سفر سے ‎ ‎ کر آئے ہیں واں اللہ اندھیرے میں اجالا

ہر شہر میں ہر ایک جگہ شوق سے پہنچے ‎ ‎ مسجد کوئی چھوڑی ہے۔ نہ چھوڑا ہے شوالا

رکھی ہے غرض خدمت اردو سے سفر میں ‎ ‎ سچ جانیے اس میں نہیں کچھ دال میں کالا

ہر ایک سخن فہم و سخن سنج سے مل کر ‎ ‎ لوگوں کے لئے جمع کیا خوب مسالا

چھپوا دیے حالات دل آویز سیاحت ‎ ‎ صد شکر انھوں نے نہ کیا حیلہ حوالا

ان شہروں کی گھر بیٹھے ہوئی سیر کہ جن کو ‎ ‎ ہم نے کبھی آنکھوں سے نہ دیکھا ہے نہ بھالا

جو کچھ ہے یہ واللہ بدولت ہے اسی کی ‎ ‎ ہے ساغر جمشید۔ یہ چھوٹا سا رسالا

فیاض ہے بے شبہ یہ احسان وجاہت ‎ ‎ چھاپا ہے سفرنامۂ بے مثل۔ نرالا

۵ سیروا فی الارض

۱۳۳۷۳

اصلاح شاعری

اڈیٹر صاحب اصلاح سخن نے یہ کتاب حال ہی میں بڑی محنت و قابلیت سے ترتیب کی ہے۔ عاشقانہ شاعری پر اُن مہمل ہونے کے جو الزام لگائے جاتے ہیں۔ اُن پر نہایت روشن خیالی اور وسیع النظری سے بحث کی ہے۔ پہلے شاعری کی کیا حالت تھی۔ اب کیا ہونی چاہئے۔ کون کون سی باتیں قابل ترمیم و تنسیخ ہیں۔ اور اس زمانے میں کیسی شاعری کی ضرورت ہے۔ شاعروں کا معشوق کیسا ہونا چاہئے۔ وصل و ہجر کے مضمون کس طرح باندھے جائیں کہ شعر سے خلاف تہذیب رنگ نہ جھلکنے پائے۔ رشک و رقابت کا شاعری سے کیا تعلق ہے۔ اور شعر میں اس کا اظہار کس حد تک مستحسن و جائز ہے۔ مرنے کے بعد گفتگو کی صورت شعر میں وار طلب ہونا کس زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ شاعرانہ تعلّی اخلاقاً و اصولاً جائز ہو سکتی ہے یا نہیں۔ عاشقانہ شاعری کے فطری اور مہمل ہونے کا زبردست ثبوت دیا ہے۔ ہم دعوے سے کہتے ہیں۔ کہ اس قسم کی کتاب اردو زبان میں آج تک نہیں لکھی گئی۔ مزید دلچسپی کے لئے شاعروں کے معشوق کی ایک نہایت عجیب و غریب تصویر شروع میں لگائی گئی ہے۔ اس زمانے کے شاعروں کو یہ کتاب ضرور منگانی چاہئے۔ شاعری کے متعلق کوئی بات نہیں چھوڑی گئی۔ ہنوز زیر طبع ہے۔ تقطیع اصلاح سخن کے برابر اور صفحے ۱۵۰ ہیں۔ پیشگی درخواست بھیجنے والے اصحاب سے قیمت ۸ر لی جاوے گی اور مابعد طبع درخواست آنے پر قیمت ۱۰ر لی جائے گی۔ ناظرین جلد درخواستیں بھیج دیں۔ تاکہ نام درج رجسٹر کر لئے جائیں۔

المشتہر

نذیر احمد منیجر رسالہ اصلاح سخن لاہور